لاشوں کا شہر

و

دیگر افسانے

مصنفہ

محترمہ مسز عبدالقادر والدہ سراج الدین ظفر

مطبوعہ

استقلال پریس لاہور

ناشر

اردو بک سٹال لاہور
(پاکستان)

اشاعت نہم — ۵۵ء — قیمت دو روپے آٹھ آنے

اپنے نورِ نظر

سراج الدین ظفرؔ بی۔اے ایل۔ایل۔بی کے نام

فہرس

عرضِ ناشر

تقریباً چھ سال ہوئے "لاشوں کا شہر و دیگر افسانے" کتاب کی شکل میں شائع ہوئے، ادبی حلقوں نے اس مجموعے کو بہت پسند کیا۔ اور جمہور نے اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس قلیل مدت میں کتاب کو سات مرتبہ چھاپنے کی ضرورت ہوئی۔ اور آٹھویں بار اب یہ کتاب پھر شائع ہو رہی ہے۔

ان افسانوں کے دل پسندِ عام و خاص ہونے کی وجہ یہ ہے کہ محترمہ مصنفہ نے ان میں وہ تمام دلچسپیاں پیدا کر دی ہیں جن کی طرف ہر انسان فطرتاً مائل ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کی اس تمام عقل پرستی کے باوجود انسان کو اب تک اَن دیکھی چیزوں

سے خوف اور ان کا شوق باقی ہے۔ مادیت کے شور و غل کے ساتھ ساتھ حسن و محبت کی باتیں ہنوز اس کے دل میں شورش برپا کرتی ہیں۔ سیر و سیاحت کا چسکا اب تک انسان کو ابھار رہا ہے، محترمہ مصنفہ کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے اپنے ان افسانوں میں عالمِ غیب، عالمِ روحانی اور عالمِ سیر و سیاحت، ان تینوں عالموں کی باتیں لکھی ہیں۔ اور خوب لکھی ہیں۔

ان افسانوں کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ہم محترمہ سے درخواست کریں گے۔ کہ وہ اپنے رہوارِ قلم کو ابھی کچھ عرصہ اور بے عنان رہنے دیں۔ تاکہ لوٹ رومان کی دنیا ان کے رہوارِ قلم کی جولانیوں سے برابر فیض یاب ہوتی رہے۔

ظہیر

راکھشش

مادرِ گیتی کے عمیق اور خاموش سینے میں ہزارہا ایسے راز پنہاں ہیں کہ اُن تک خرد کی رسائی نہیں۔ دُنیا کی چھوٹی چھوٹی روایات جن کو ہم لوگ ہنسی مذاق میں اُڑا دیتے ہیں، بعض اوقات ایسے گُل کھلاتی ہیں کہ دُنیا مبہوت ہو جاتی ہے۔

میری آپ بیتی بھی قرونِ اولیٰ کے ایک راز کی حامل ہے، جب میں نے ہوش سنبھالا تو گھر میں ہم دو بھائی بہن تھے۔ اور ایک ہماری بیوہ خالہ، میرے والدین فوت ہو چکے تھے۔ اس لئے خالہ نے میری پرورش کی تھی۔ میرا وطن جھنگ ہے۔

ہیر کے مقبرے کے قریب موضع مرادیانی میں ہمارا مکان تھا۔ اور ہماری حویلی گاؤں کے آخری سرے پر ایک ویرانے میں واقع تھی۔

یہ حویلی کسی پرانے زمانے کی بنی ہوئی قلعہ نما عمارت تھی۔ جو اتنی وسیع تھی، کہ اس میں ایک اچھا خاصا گاؤں آباد ہو سکتا تھا۔ اسے کسی زمانے میں ہمارے آبائے سلف نے گاؤں فتح کر کے حاصل کیا تھا۔ اس کے ایک حصہ میں ہم لوگ رہتے تھے۔ اور دوسرے میں مویشی اور اُن کے رکھوالے وغیرہ، باقی تمام خالی پڑی تھی۔

ہمارے احاطہ کے ایک کونے میں جو ببول کے درختوں میں گھرا تھا، پنڈت دینا ناتھ رہتے تھے۔ یہ میرے دادا کے وقت کے بوڑھے کارندہ تھے۔

بھائی جان جو مجھ سے اٹھارہ سال بڑے تھے، تنہائی پسند اور گوشہ نشین تھے۔ حویلی کے بالاخانے پر شور و غل سے دُور بالکل سنسان جگہ ان کا کمرہ تھا۔ جہاں وہ دن رات پڑے رہتے تھے۔ کسی سے ان کا میل جول نہ تھا۔ ہمارا یہ مختصر سا کنبہ اس غیر آباد حویلی کے سکوت اور نحوست کو دُور کرنے کی طاقت نہ رکھتا تھا۔ ہر طرف شہرِ خموشاں کا نقشہ دکھائی دیتا تھا۔

ایک طویل عرصہ تک مرمت نہ ہونے سے حویلی کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ کئی جگہ سے زینے اور مہتابیاں بالکل شکستہ ہو چکی تھیں فصیلوں اور دمدموں پر جا بجا کاہی جمی ہوئی تھی۔ تمام چھتوں پر ایک خاردار بوٹی

بکثرت پھیلی تھی۔ ویران کمروں میں پلستر گرنے سے کوڑا کرکٹ کے انبار لگے ہوئے تھے۔ چھتوں میں جابجا ابابیلوں کے گھونسلے اور بھڑوں کے چھتے نظر آتے تھے۔ بڑے بڑے تناور درختوں نے اکثر کمروں کو بالکل تیرہ و تار بنا رکھا تھا۔ صرف وہی چند کمرے اچھی حالت میں تھے، جو ہم لوگوں کے زیرِ استعمال تھے۔

ہماری کوئی لمبی چوڑی برادری بھی نہ تھی۔ کہ کبھی اس قیدِ تنہائی سے نجات ملتی۔ صرف میرے ایک چچا تھے، جو ہمارے گاؤں سے آٹھ میل کے فاصلے پر اپنی جاگیر میں رہتے تھے، ان کی بیوی بھی فوت ہو چکی تھی۔ صرف ارشد اور عزیز دو لڑکے تھے۔ جو تعلیم حاصل کرنے ولایت گئے ہوئے تھے۔ اُن کے بڑے لڑکے ارشد سے میں منسوب تھی۔

میں آٹھ سال کی بچی تھی۔ اس ویرانے میں جہاں در و دیوار سے حسرت اور اُداسی برستی تھی۔ میری طبیعت بہت گھبرایا کرتی۔ اگر پنڈت جی کا مکان قریب نہ ہوتا، تو یقیناً ایسے ماحول میں میری زندگی دشوار ہو جاتی۔

پنڈت جی کا کنبہ بھی بالکل مختصر تھا۔ ایک تو خود پنڈت جی تھے، دوسری ان کی دائم المریض بیوی اور ایک لڑکی کملا۔ جو مجھ سے پانچ سال بڑی تھی۔ مجھے کملا سے بڑی محبت تھی۔ اور میں اکثر اس کے گھر کھیلنے جایا کرتی تھی۔

دوپہر کے وقت جب کملا کی ماں آرام کرتی، اور پنڈت جی باہر کام پر ہوتے تو میں اور کملا مٹی کے گھروندے بنا کر کھیلا کرتیں، یا پنڈت جی کے ٹھاکر دوارے میں جہاں کئی مورتیاں رکھی تھیں، ایک بڑے قد آور بُت کو پگڑی باندھ کر اپنا دُولھا بناتیں۔ اور اس کے دائیں بائیں کھڑے ہو کر وہ گیت گایا کرتیں، جو قلندر قوم کے فقیر ہمارے علاقہ میں گا کر بھیک مانگا کرتے ہیں۔

بالاخانے کی سیڑھیوں کے قریب ایک بڑا بھاری اور فراخ کنواں تھا، ہم دونوں عموماً اس کنوئیں پر جاتیں، اور اس میں اونچی آواز سے پکارتیں، جس کے جواب میں ہمیں اُسی طرح کی آواز سنائی دیتی، اور ہم بہت خوش ہوتیں، بھائی جان ہمیں اس کنوئیں پر جانے سے منع کیا کرتے، اور ڈرایا کرتے، کہ اس کنوئیں میں بھوت رہتے ہیں۔

خالہ جان بھی مجھے اس کنوئیں پر جانے سے روکا کرتیں، وہ کہا کرتی تھیں، کہ یہاں پہلے ایک چبوترہ تھا، بھائی جان کو کسی ذریعے سے اس جگہ کنوئیں کی موجودگی کا علم ہو گیا۔ میں اُس وقت چھوٹی تھی، چنانچہ انہوں نے اس کنوئیں کو جو کئی عدیوں سے بند پڑا تھا، کھول کر از سرِ نو مرمت کرا دیا، اسی سال میری ماں اس کنوئیں پر کسی بھوت سے ڈر کر بیمار ہوئیں۔ اور دوسرے دن جاں بحق تسلیم ہو گئیں، اگرچہ ہم یہ سب باتیں غور سے سُن لیا کرتی تھیں، مگر وہاں جانے سے باز نہ آتیں، کیونکہ ہمیں اس کنوئیں

سے کچھ اُنس سا ہو گیا تھا۔

(۲)

چند سال تک میں اسی طرح بے سر و سامانی سے کھنڈروں کی دنیا ہی میں پرورش پاتی رہی۔ آخر زمانے کے انقلاب نے مجھے کچھ سے کچھ بنا دیا یعنی میں نے بچپن کی منزل طے کر کے شباب کے زینے پر قدم رکھا۔ کملا مجھ سے پانچ سال بڑی تھی۔ اس وقت وہ عین شباب میں تھی۔ اور باغِ حسن کا ایک نایاب پھول معلوم ہوتی تھی۔ اس کا صندلی رنگ، نشیلی انکھڑیاں اور پیوستہ ابرو اس کی شانِ حسن کو دوبالا کر رہے تھے۔ اس کی خوبصورتی دلوں کو تڑپا دینے والی تھی، اور حسن بے حد جاذبیت رکھتا تھا۔

پنڈت جی پرانے خیال کے آدمی تھے۔ جوں جوں اس چنبیلی کی کلی کو چٹکتے دیکھتے ان پر خواب و خور حرام ہوتا جاتا تھا۔ جوان لڑکیوں کو گھر بٹھانا ان کے نزدیک مہا پاپ تھا۔ اس لئے انہوں نے بہت جلد کملا کی شادی کا بندوبست کر لیا اور تاریخ مقرر ہو گئی۔

شادی سے ایک دن پیشتر کملا اور اس کے والدین حسبِ معمول سو رہے تھے، آدھی رات کے قریب کسی نے کملا کا شانہ ہلایا۔ کمرے میں مکمل تاریکی تھی۔ طاقچہ پر رکھی ہوئی لالٹین بجھ چکی تھی۔ کملا اپنے

قریب کسی کی موجودگی کا احساس کر کے خوف سے گھبرا گئی۔

یکایک کسی ہاتھ نے جو برف کی طرح سرد اور لوہے کی طرح سخت تھا، ایک پرچہ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ کملا لرز اٹھی، اُس نے گھگھیائی آواز سے پنڈت جی کو پکارا۔ دونوں میاں بیوی جاگ اٹھے۔ پنڈت جی نے تاریکی میں ٹٹولتے ہوئے دیا سلائی تلاش کر کے بتی جلائی تو لرزہ بر اندام کملا نے اُن سے یہ واقعہ بیان کر کے پرچہ اُن کے ہاتھ میں دے دیا۔

یہ پرچہ پنڈت جی کے رجسٹر سے پھاڑا گیا تھا۔ اور کوئلہ سے اُس پر چند سطریں کسی مُردہ زبان میں جو سنسکرت سے ملتی جلتی تھی لکھی گئی تھیں۔

کملا سخت متوحش تھی، مگر اس کے والدین کا خیال تھا، کہ کملا نے خواب کی حالت میں کوئی کاغذ اُٹھا لیا ہے۔

رات کو کملا کی برات تھی۔ بڑے ٹھاٹھ سے برات کے استقبال کا سامان ہو رہا تھا۔ آج سہ پہر کو ہماری حویلی میں خوب رونق تھی، ہمارے مردانہ کمرے دُلہن کی طرح سجے ہوئے تھے۔ باہر چھڑکاؤ سے سوندھی مٹی کی خوشبو آ رہی تھی۔ کمرے میں برات کے لئے پھولوں کے طشت بھرے پڑے تھے، جن سے عطر بیز لپٹیں آ رہی تھیں، کھانوں سے زعفران اور

کیوڑے کی مہک اُمڈ رہی تھی۔ گاؤں کی نوخیز لڑکیاں رنگین لباس پہنے گا رہی تھیں۔

میں آج بہت خوش تھی۔ کیونکہ اپنی عمر میں پہلی مرتبہ میں نے چہل پہل دیکھی تھی شام کے قریب برات آئی اور رات گئے تک برات کی خاطر تواضع ہوتی رہی۔ میں بھی رات گو دیر سے سوئی۔ مجھے کملا کی جدائی کا روح فرسا خیال ماہئی بے آب کی طرح تڑپا رہا تھا۔

ابھی میری آنکھ جھپکی ہی تھی۔ کہ میں شور و غل کی آواز سے جاگ اُٹھی۔ رات بھیگی ہوئی تھی، ستارے جھلملا رہے تھے۔ گیس کی روشنی بدستور جگمگا رہی تھی۔ مگر جو جگہ تھوڑی دیر پہلے عشرت کدہ تھی۔ اب ماتم کدہ بن رہی تھی۔ پنڈت صاحب کے مکان سے چیخوں کی دردناک آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ سب چھوٹے بڑے سراسیمگی سے احاطہ کی طرف بھاگ رہے تھے۔ میں حیران تھی۔ کہ کیا معاملہ ہے۔ اتنے میں بھائی جان میرے پاس سے گذرے۔ اُن کے بال پریشان اور چہرہ اُترا ہوا تھا۔ وہ بد حواسی سے بھاگے جا رہے تھے۔ دالان میں خالہ جان کھڑی تھیں، مجھے دیکھتے ہی کہنے لگیں "زرینہ! کملا کا شوہر قتل ہو گیا ہے اور اس کی ماں بھی کوئی دم کی مہمان ہے۔" خالہ جان کے یہ الفاظ سُنکر میرے دل کو دھکا سا لگا، اور ڈرتی ہوئی کملا کے گھر گئی۔ اس کی ماں واقعی جاں بلب تھی، اس کی نبضیں چھوٹی ہوئی تھیں۔ ایک ڈاکٹر جو برات کے ساتھ آئے

ہوئے تھے، اس کو بچانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یکایک ڈر جانے کا نتیجہ ہے۔

پنڈت جی پچھاڑیں کھا رہے تھے۔ کملا بالکل خاموش اور سہمی ہوئی تھی۔ وہ تو ملتانی مٹی کا بُت معلوم ہو رہی تھی۔ صبح سویرے ہی پنڈت جی کی بیوی چل بسیں۔

باہر لوگوں کا بڑا ہجوم تھا۔ پولیس بیان لکھ رہی تھی۔ دولہا کی لاش کا معائنہ کیا گیا۔ ڈاکٹر کے قول کے مطابق قاتل نے لوہے کے دستانے پہن کر جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ کئی دن تک پولیس کی تحقیقات جاری رہی۔ مگر باوجود انتہائی تفتیش کے قاتل کا کوئی سراغ نہ ملا۔

(۳)

کملا کی بیوگی کو ایک سال گذر گیا۔ اس کی شوخی اور شگفتگی کافور ہو چکی تھی۔ وہ اپنا غم ظاہر نہ کرتی تھی۔ تاہم ہر وقت کچھ سوچتی اور سرد آہیں بھرتی رہتی۔ اس کا حسن ماند پڑ چکا تھا۔ اور اس کا شباب جاڑے کی چاندنی کی طرح بیکار۔

میں بھی اب جوان ہو چکی تھی۔ ارشد اور عزیز بھی ولایت سے واپس آ گئے تھے۔ چچا جان میری شادی کے لئے اصرار کرنے لگے۔ خالہ جان کا

خیال تھا کہ ہم دونوں بھائی بہن کی ایک ہی وقت میں شادی ہو. مگر بھائی جان نے اپنی شادی سے تو صاف انکار کر دیا. اور میری شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی.

شادی سے چار دن قبل میں اور کملا رات کو دیر تک جاگتی رہیں. ہماری بڑھی ماما ہمیں آدھی رات تک کہانیاں سناتی رہی. اسلئے میں لیٹتے ہی غافل ہو گئی.

آخر شب میں نے ایک ہولناک خواب دیکھا. کہ ایک دیو میرے پلنگ کے قریب کھڑا مجھے ایک پرچہ دے رہا تھا. مجھ پر یک لخت دہشت طاری ہو گئی. بے اختیار میری چیخ نکل گئی. آنکھ کھلی تو میں پسینہ میں تر ابور تھی. اِدھر اُدھر دیکھا. مگر کوئی دیو وغیرہ دکھائی نہ دیا.

یک دم میری نظر سرہانے کے قریب پڑے ہوئے ایک کاغذ کے پرچے پر پڑی. میرے ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے. اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا. کملا نے جو میری چیخ سن کر بیدار ہو گئی تھی. مجھے سنبھالا.

کچھ دیر بعد جب مجھے ہوش آیا. تو گھر بھر جاگ رہا تھا. میں نے حواس بجا ہونے پر پھر اس پرچہ کی طرف توجہ کی. جو ابھی تک بدستور وہیں پڑا تھا وہ پرچہ اٹھا کر میں نے بھائی جان کو دے دیا. اور خواب بھی من وعن کہہ سنایا. انہوں نے پرچہ میرے ہاتھ سے لے کر الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا.

وہ اس ناگہانی واقعہ سے متوحش نظر آتے تھے. ان کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی. یہ پرچہ بھی کسی پرانے رجسٹر سے پھٹا ہؤا معلوم ہوتا تھا. جس پر

کسی غیر معروف زبان میں کوئلے سے چند سطریں لکھی تھیں۔ بھائی جان پہلے تو سراسیمگی اور مایوسی کی حالت میں کھڑے سوچتے رہے۔ اور پھر چپ چاپ باہر نکل گئے۔

صبح کو چچا جان بوکھلائے ہوئے میرے پاس آئے۔ ان کے ہمراہ بھائی جان بھی تھے۔ چچا جان نے میری زبانی سب واقعہ سنا۔ اور دیر تک اس معاملہ پر بحث ہوتی رہی۔ ان کا خیال تھا۔ کہ یہ کسی دشمن کی کارستانی ہے۔ اور شادی کو روکنے کے لئے اس تدبیر سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ مگر بھائی جان اپنی ہٹ پر قائم رہے۔ اور شادی کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دی گئی۔

چند دن تک لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ جب بات پرانی ہو گئی اور لوگ اس تذکرہ کو بھول گئے۔ تو بالکل خفیہ طور پر میرا نکاح ارشد سے ہو گیا۔ لیکن تقدیر کا لکھا ٹل نہ سکا۔ اور دوسرے دن ارشد بستر پر مُردہ پایا گیا۔ اس کے گلے پر بھی کسی ایسے ہاتھ کے نشانات تھے۔ جس پر لوہے کا دستانہ چڑھا ہُوا ہو۔

ارشد کی جواں مرگی کا تمام علاقے میں شور مچ گیا۔ ایسا سنگین جرم اور قاتل کا بچ نکلنا پولیس کی بدنامی کا باعث تھا۔ چنانچہ بڑے بڑے افسر جائے وقوع کا معائنہ کرنے آئے۔ اور قاتل کا سراغ لگانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ مگر نتیجہ خاک نہ نکلا۔ اور کملا کے شوہر کی طرح ارشد کی موت بھی

ایک معمّہ بن کر رہ گئی۔

ارشد کی موت سے میری زندگی تلخ ہوگئی۔ بھائی جان کا دل بھی دنیا سے اُچاٹ ہوگیا۔ پنڈت جی کو جو اپنی بیوی کی موت کے بعد کچھ نڈھال رہتے تھے ہمارے خاندان سے دلی محبت کی وجہ سے اتنا صدمہ ہُوا کہ وہ بھی جانبر نہ ہو سکے، اور شمع کی طرح چند دن میں گھل کر ختم ہوگئے۔

میں اور کملا زندگی کے فضول اور خاموش دن کاٹنے لگیں۔ کبھی کبھی عزیز ہم دونوں سے ملنے آیا کرتا۔ اس کے آنے سے دو گھڑی کے لئے ہمارے دل بہل جایا کرتے۔ ورنہ پھر وہی تنہائی اور افسردگی گھیرے رکھتی۔ ہم اس زندگی سے بہت بیزار تھیں۔ ہماری زندگی ایک ناکام زندگی تھی جس کے کامیاب ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ ہمارا مستقبل ایسا تاریک تھا۔ جس میں امید کی شعاع باقی نہ تھی۔ ہمیں ایک ایسا روگ لگ چکا تھا، جس کا علاج اس زندگی میں ناممکن تھا۔

۴

ارشد کی موت کو تین سال گذر گئے۔ بہار کے بعد خزاں اور خزاں کے بعد بہار آتی رہی۔ لیکن ہماری زندگی میں کوئی تغیر و تبدّل نہ ہُوا۔

خزاں کا موسم تھا۔ درختوں کے پتّے جھڑ رہے تھے۔ ہر چیز بے رونق اور

بے نور ہو رہی تھی۔ شام قریب تھی، آفتاب آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ اس کی زرد اور لرزاں شعاعیں کسی دم توڑتے ہوئے مریض کی طرح زندگی کی موہوم امید پر سنبھلنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ کوّے غول در غول اڑتے اور اپنی کھوکھلی آوازیں کائیں کائیں کرتے جنگل میں بسیرا کرنے جا رہے تھے۔ مویشی اور ان کے چرواہے تھکے ماندے سست قدم اٹھاتے گھر واپس آ رہے تھے۔ گاؤں کے ہر ایک گھر سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ ہر طرف اُداسی اور افسردگی مسلّط تھی۔

اتنے میں عزیز آگیا۔ اور ہم دونوں فصیل کی ہتنابیوں پر ٹہل کر وقت گذارنے لگے۔ جب آفتاب غروب ہوگیا۔ اور ہواہیں خنکی پیدا ہونے لگی۔ تو میں نیچے اترنے کے لئے مڑی۔ مگر عزیز کہنے لگا۔

"اب تو بھائی جان کا کمرہ قریب ہے، چلو ان سے بھی مل لیں۔ آج ان کو دیکھے بہت دن ہو گئے ہیں۔

چنانچہ ہم بالاخانہ پر چڑھ گئے، نزدیک پہونچے تو اندر سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔

عزیز۔ بھائی جان تو کسی سے باتیں کر رہے ہیں۔

میں۔ (حیرت سے) بھائی جان کے پاس بالاخانہ پر کون آسکتا ہے۔ آؤ دیکھیں تو سہی۔

عزیز۔ اس طرح اندر جانا مناسب نہیں۔ چلو اس سامنے والی بغلی سہ دری میں چل کر جھروکے سے دیکھیں۔

ہم دونوں سہ دری میں گھس گئے۔ یہ سہ دری بہت طویل اور تاریک تھی۔ گو باہر بھی شام کافی ہو چکی تھی۔ مگر سہ دری میں بالکل اندھیرا تھا۔

کملا کھڑکی کی کارنس پر بیٹھی تھی۔ اس کا گلابی رنگ نیلا ہو رہا تھا۔ اور ہونٹ بالکل سفید و خشک، جن پر وہ بار بار زبان پھیر رہی تھی۔ بھائی جان اس کے قریب جھکے ہوئے کھڑے تھے۔ ان کی پشت ہماری طرف تھی۔ اور کملا کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کسی چیز کو غور سے دیکھ رہے تھے۔

ابھی ہم لوگ وہاں بمشکل چند سیکنڈ ٹھہرے تھے۔ کہ آسمان پر شہاب ثاقب ٹوٹا۔ آہ! اس کی مہیب روشنی میں ہم نے سہ دری کے اندر ایک ایسا خطرناک سین دیکھا۔ کہ ہمارے کلیجے دھک سے رہ گئے شدتِ خوف سے میرے حواس بجا نہ رہے اور مجھے غش آگیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے کمرے میں پلنگ پر پڑی تھی۔ اور عزیز سہما ہوا میرے قریب ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ میں نے ہوش میں آتے ہی کہا۔

"عزیز خدا کے لئے جاکر بھائی جان کو بلا لاؤ۔ ان کی زندگی خطرے

میں ہے۔"

عزیزہ نے میرا آخری فقرہ سنا۔ اور جلدی سے باہر نکل گیا۔ میں بھائی جان کو دیکھنے کے لئے بہت بیتاب تھی۔ اس لئے بے چینی سے اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

خدا خدا کر کے عزیزہ واپس آیا۔ بھائی جان بھی اس کے ساتھ تھے "کیوں زرینہ کیا تکلیف ہے؟" انہوں نے آتے ہی کہا۔

میں۔ بھائی جان میں آپ کو آگاہ کرنا چاہتی ہوں . . . . کہ آپ کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔ آج جس وقت آپ کملا سے باتیں کر رہے تھے۔ میں اور عزیزہ آپ سے ملنے کے لئے بالاخانے کی طرف گئے۔ اندر سے باتوں کی آواز سن کر مجھے بہت تعجب ہُوا۔ اور ہم دونوں یہ معلوم کرنے کی غرض سے کہ آپ کس سے باتیں کر رہے ہیں۔ سہ دری میں گھس گئے۔

یکایک شہاب ثاقب ٹوٹا۔ اور اس کی سرخ روشنی میں، میں نے دیکھا کہ ایک گرانڈیل اور قوی ہیکل شخص جو زرہ بکتر پہنے تھا۔ سہ دری کے آخری جھروکے کے قریب کھڑا آپ کی باتیں سن رہا تھا۔ میں اتنی خوف زدہ ہوئی کہ مجھے غش آ گیا۔ اگر عزیزہ ساتھ نہ ہوتا تو خدا جانے میرا کیا حشر ہوتا۔

بھائی جان۔ زرینہ کچھ فکر نہ کرو۔ وہ مردود جلد ہی اپنے کیفرِ کردار کو

پہنچنے والا ہے۔ اگر اس وقت مجھے اس کی موجودگی کا پتہ لگ جاتا۔ تو میں اسی وقت اُسے سزا دیتا۔

میں۔ تو کیا آپ اُسے جانتے ہیں، وہ کون شخص ہے؟

بھائی جان۔ وقت آنے پر تم خود اسے دیکھ لوگی۔ فی الحال میں اس سے روشناس نہیں ہوں۔

میں۔ بھائی جان کملا بالاخانہ پر آپ کے پاس کیوں گئی تھی۔ اور اس کے ہاتھ میں کیا چیز تھی۔

بھائی جان۔ وہ ایک خاص وجہ سے گئی تھی۔ اور اس چیز کی بابت بھی تھوڑے دنوں تک بتا دیا جائے گا۔ اور اس کے علاوہ میں تمہیں یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے کملا سے محبت ہے اور وہ بھی مجھے چاہتی ہے۔ اور میری زوجیت میں آنے پر رضامند ہے۔

اس کے بعد میں نے بھائی جان سے التجا کی۔ کہ وہ بالاخانہ کو چھوڑ کر یہیں آجائیں۔ چنانچہ انھوں نے میری بات پر عمل کیا۔ اور میرے ساتھ والے کمرے میں اٹھ آئے۔ صبح کملا میرے پاس آئی۔ تو میں نے اس سے بھی اس چیز کی بابت دریافت کیا۔ جو رات کو اس کے ہاتھ میں تھی۔ مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور کچھ خیال کر کے کانپنے لگی۔ البتہ اس نے اتنا کہا۔ کہ مجھے تمہارے بھائی جان سے محبّت ہے۔ اور انہیں

بھی میرے ساتھ اسی قدر انس ہے۔ اسی لئے وہ ابھی تک مجرّد ہیں۔ میں ان سے کبھی شادی کا وعدہ نہ کرتی۔ مگر وہ یقین دلاتے ہیں۔ کہ انہیں اس سے کسی قسم کا خطرہ نہیں۔

اگرچہ بھائی جان بھی اپنے کو محفوظ بتاتے تھے۔ تاہم میرے دل کا ظن دور نہ ہوتا تھا۔ میں نے کئی دفعہ انہیں شادی سے روکا۔ مگر شنوائی نہ ہوئی۔

اس واقعہ کے دسویں دن سہ پہر کو کملا کا نکاح بھائی جان سے بالکل سادے طریقے پر ہوگیا۔ کملا عروسی لباس میں ایک شاندار پیکر نورانی معلوم ہوتی تھی بھائی جان آج بہت خوش تھے۔ مگر ہم سب غمگین ہو رہے تھے۔ خالہ جان آنکھیں پُرنم کئے مصلّے پر آزردہ خاطر بیٹھی تھیں۔ میں بھی تصویر یاس بنی اپنے کمرے میں پڑی تھی۔ اور پاس عزیز اُداسی سے منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔

جوں جوں شام ہو رہی تھی۔ میرے دل میں خوف پیدا ہو رہا تھا۔ آج رات چچا جان اور عزیز بھی یہیں رہے۔ میں نے عزیز سے صلاح کی کہ رات کو جاگ کر بھابی جان کی حفاظت کرنا چاہئے۔ ہم دونوں اس دروازے کے قریب جو میرے اور بھائی جان کے کمرے کے درمیان کھلتا تھا، کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اور ٹارچ اپنے پاس رکھ لئے۔ تاکہ اگر کوئی لیمپ گل کردے تو روشنی بہم پہنچا سکیں۔

خزاں کی راتیں عموماً پریشان کن ہوتی ہیں۔ لیکن آج تو رات خاص کر

ڈراونی اور تاریک تھی۔ جس کو اُلّو کی بھیانک چیخیں اور بھی خوفناک بنا رہی تھیں۔ باہر آوارہ کتے دردناک آوازیں رو رہے تھے۔ اور پتوں کی سرسراہٹ جھینگر کی منحوس آواز کی ساتھ مل کر نہایت ہولناک سماں پیش کر رہی تھی۔

ایک بجے کے قریب یکایک کملا کی چیخ سنائی دی۔ اور ہم جھپٹ کر اندر جا پہنچے۔ وہاں ہم نے ایسا نظارہ دیکھا۔ جس کو عقل سلیم کبھی باور نہیں کر سکتی اور قیاس کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ بھائی جان مسہری پر پڑے تھے۔ اور قوی ہیکل بت جسے میں اور کملا بچپن میں اپنا دولہا بنا کر دو سوتوں والا گیت گایا کرتی تھیں اپنے آہنی پنجوں سے ان کا گلہ دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم دونوں جلدی موقع پر پہنچ گئے۔ اور چچا جان بھی جو ہماری طرح جاگ رہے تھے۔ فوراً آ پہنچے۔

ہمارے آتے ہی بت بے حس و حرکت مسہری پر گر پڑا۔ اور ہم سب نے مل کر بھائی جان کو اس بت کے نیچے سے نکالا۔ ہر کوئی اس عجیب وغریب انکشاف سے ششدر تھا۔ اور اس بت کو خوف و حقارت سے دیکھ رہا تھا۔

آخر بھائی جان نے مہر سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

"چچا جان! اگر آپ لوگ تکلیف کریں۔ تو میں اس مردود کو ہمیشہ کے لئے دنیا سے نابود کر دوں"۔

چچا جان ، وہ کیونکر ؟

بھائی جان کے کہنے پر ہم سب لوگ اسے گھسیٹتے ہوئے پرانے کنوئیں تک لے گئے ۔ اور اُسے اس میں پھینک دیا ۔ بھائی جان نے تانبے کی ایک بڑی چادر جو بالاخانے پر دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی تھی ۔ ملازموں سے منوائی اس تمام چادر پر غیر معروف زبان میں کوئی عبارت کندہ تھی ۔ اسی سے کنوئیں کا منہ ڈھانپ دیا گیا ۔ اور اس پر سلیں چن دی گئیں ۔ جو قریب کی ایک کوٹھڑی میں پڑی تھیں ۔ اس کارروائی کے بعد ہم سب واپس آگئے ۔

(۵)

بھائی جان واپس آتے ہی کہنے لگے ۔ " اس کنوئیں کی جگہ کبھی ایک خوبصورت چبوترہ تھا ۔ جب میں بچہ تھا ۔ تو دوپہر کے وقت اپنا بستہ لے کر اکثر اس چبوترہ میں آبیٹھتا ۔ اور اپنا سبق یاد کرتا ۔ اس وقت چبوترے پر سلوں کا فرش تھا ۔ کئی سلوں پر کچھ کھدا ہوا تھا ۔ پنڈت جی نے مجھے بتایا ۔ کہ وہ سنسکرت کے کچھ الفاظ ہیں ۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد جب میں علیگڑھ گیا ۔ تو میری دوستی ایک جرمن پروفیسر سے ہوگئی جو مردہ زبانوں کا ماہر تھا ۔ اس کی ہم جلیسی میں میں اس فن کا ماہر ہوگیا ۔ میں دو سال اس کے زیر تعلیم رہا ۔ اس کے بعد وہ جرمنی چلا گیا ۔ مگر اس عرصہ میں ۔ میں نے اس

فن میں کافی مہارت حاصل کر لی۔

جب میں فارغ التحصیل ہو کر گھر آیا۔ تو میں نے چبوترے کی سلوں والی عبارت پڑھنے کی کوشش کی۔ یہ مختلف راجاؤں کے عہد کی تحریریں تھیں جن کا یہ مطلب تھا۔ کہ اس کنوئیں میں دبا بند ہے۔ کچھ سلوں پر بہت پرانے زمانے کی تحریریں تھیں۔ اس لئے میں وہ نہ پڑھ سکا۔ لیکن طرز تحریر سے میں نے قیاس لگایا۔ کہ ان سلوں پر بھی کسی وقت کے بادشاہوں نے کنوئیں کی ممانعت کے متعلق کچھ لکھوایا ہوگا۔

انسان کی فطرت ہے کہ جس کام سے اسے روکا جائے اس کام کی بیحد خواہش اس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی حال میرا بھی تھا۔ آخر میں اپنی طبیعت کے جوش کو نہ روک سکا۔ اور سلیں اکھڑوا ڈالیں۔ سلوں کے نیچے کسی مصالحہ کے پلستر کی ایک بہت موٹی تہ تھی۔ جو بہت مشکل سے اکھاڑی گئی۔ اس تہ کے نیچے یہی تانبے کی موٹی چادر تھی، جو اب کنوئیں کے منہ پر رکھی گئی ہے۔ میں اس چادر کا ایک حرف بھی نہ پڑھ سکا۔ اس لئے میں نے وہ چادر بالاخانہ کی دیوار کے ساتھ رکھوا دی۔

کنواں کھل گیا۔ مگر مجھے اطمینان نہ ہُوا۔ میں تمام رات سوچتا رہا۔ کہ یہ کنواں کیوں بند کیا گیا تھا۔ اور کیوں اس کے کھولنے کی ممانعت کی گئی تھی۔ دوسرے دن میں نے اپنے بوڑھے ملازم کو کنوئیں میں اُتارا۔ تو اس نے بتایا۔

کہ کنوئیں میں پانی کے اندر ایک گز کی گہرائی پر تانبے کا جال پڑا ہے۔ جس میں بہت سے برتن اور دوسری چیزیں موجود ہیں۔

میرے کہنے پر اس نے ایک برتن جو گاگر کی قسم کا تھا۔ باہر نکالا۔ یہ برتن دیر تک نمناک مٹی میں پڑا رہنے سے سیاہ ہو رہا تھا۔ رگڑ کر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ سونے کا ہے۔ میں نے شک دور کرنے کے لئے ریتی سے اسے کاٹا۔ اور دوسرے دن جھنگ لے جا کر سنار کو دکھایا اس نے بھی اسے سونے ہی کا بتایا۔

انتہائی سوچ بچار کے بعد میں نے ایک کٹھالی خریدی۔ اور رات کے وقت اپنے کمرے میں اس برتن کو گلا کر اینٹوں کی شکل میں تبدیل کر لیا۔ بعد ازاں میں دوسرے تیسرے دن اس بوڑھے ملازم سے ایک برتن نکلواتا۔ اور رات کو پگھلا کر اینٹیں بنا لیتا۔ اسی خفیہ طریقے سے میں نے کچھ عرصے میں وہ برتن ٹھکانے لگا دیئے۔

باقی سامان بہت وزنی لوہے وغیرہ کا تھا جو اکیلے آدمی سے نکلنا محال تھا۔ اس لئے اب یہ معاملہ پوشیدہ نہ رہ سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے قیمتی خزانے کی خیر مناتے ہوئے کنوئیں کا باقی ماندہ سامان پنڈت جی کی تحویل میں دے دیا۔ وہ مزدوروں کے ساتھ خود کنوئیں میں اترے اور سامان کی فہرست بنا کر مجھے دکھلائی۔

گو مجھے یاد نہیں کہ وہ کیا کیا چیزیں تھیں۔ مگر اتنا ضرور معلوم ہے۔ کہ وہ چیزیں میرے مصرف کی نہ تھیں۔ اس لئے میں نے پنڈت جی سے کہا یہ چیزیں لاہور کے عجائب گھر میں بھیجدی جائیں۔ سو وہ چیزیں پنڈت جی ہی نے نکلوائیں اور عجائب گھر میں بھیج دیں۔ میں اس وقت موجود نہ تھا پنڈت جی چونکہ پرانے خیال کے آدمی تھے۔ انہوں نے اس بت کو کسی دیوتا کی مورتی سمجھ کر اپنے ٹھاکر دوارے میں رکھ لیا ہوگا۔ بہرحال مجھے اس بت کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔ چادر کی عبارت پڑھنے کا مجھے بہت شوق تھا۔ اس لئے میں ہر وقت اسی میں محو رہنے لگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں گوشہ نشین مشہور ہو گیا۔

کملا سے مجھے بچپن سے محبت تھی۔ مگر مذہب کے تفاوت سے اظہار نہ کر سکا۔ اور تمام عمر مجرّد رہنے کا ارادہ کر لیا۔ کملا کی شادی کے موقعہ پر مجھے بہت رنج ہوا۔ تاہم میں نے حوصلہ نہ ہارا، اور شادی میں سرگرمی سے حصّہ لیتا رہا۔

شادی سے ایک رات پہلے جو پرچہ کملا کو ملا تھا۔ اس کے حروف چادر کے حروف سے بالکل ملتے جلتے تھے۔ اگرچہ میں اسے بھی نہ پڑھ سکا لیکن وہ پرچہ میں نے پنڈت جی سے لے کر رکھ لیا۔ اور بعد ازاں جب زرینہ کو ویسا ہی پرچہ ملا۔ تو میں نے اس کی شادی ملتوی کر دی۔ اور باوجود

انتہائی حفاظت و رازداری کے بھی ارشد کی موت واقع ہوگئی۔

اس واردات سے مجھے یقین ہوگیا۔ کہ تانبے کی چادر کے سوا کسی شے سے قاتل کا سراغ دستیاب نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ میں اس عبارت کے پڑھنے کی سر توڑ کوشش کرنے لگا۔ اور تین سال کی لگاتار محنت کے بعد کامیاب ہوگیا۔

اس تحریر سے معلوم ہُوا کہ کئی ہزار سال پہلے ایک راکھشش برلاس نامی رہتا تھا۔ یہ بڑا ظالم تھا۔ لوٹ مار کے علاوہ حسین عورتوں پر بھی ہاتھ صاف کیا کرتا تھا۔ یہاں سے پانچ میل کے فاصلہ پر کنولا شہر آباد تھا۔ کنولا راجہ دیپک کی راجدھانی تھی۔ راجہ بڑا دھرماتا تھا۔ رعایا کی تکلیف دور کرنے کے لئے اس نے کئی دفعہ اس راکھشش پر فوج کشی کی۔ مگر اسے زیر نہ کرسکا۔

کنولا کے قریب وجوار میں ایک نہایت حسین عورت رہا کرتی تھی۔ یہ عورت شوجی کی پجارن تھی۔ برلاس اپنی طاقت کے گھمنڈ میں اس پر بھی دست درازیاں کرنے لگا۔ اور پجارن اس کی چیرہ دستیوں سے تنگ آکر شوجی سے امان چاہی۔ چنانچہ شوجی کی پھٹکار سے اس راکھشش کی صورت مسخ ہوگئی۔ اور اس کا گھر کنواں بن گیا۔ جس میں وہ معہ اپنے خزانے کے قید کر دیا گیا۔ اس کنوئیں کا منہ تانبے کی چادر سے ڈھانپ کر شوجی نے اس پر ان واقعات کے علاوہ ایک منتر بھی لکھ دیا۔ تاکہ

راکھشش کسی صورت باہر نہ نکل سکے۔

اس چادر میں واضح طور پر درج تھا۔ کہ اس کنوئیں کا کھولنا خلافِ مصلحت ہے۔ لیکن اگر کوئی سونے کے لالچ سے اسے کھول بھی لے۔ تو اسے چاہیئے کہ وہ اس راکھشش کو ہرگز نہ نکالے اور سونا لے کر کنوئیں کو پہلے کی طرح بند کر دے۔ اب اس عبارت کی مدد سے میں نے وہ پرچے بھی پڑھ لئے۔ جو شادی سے پہلے کملا اور زرینہ کو ملے۔ ان پرچوں کا مضمون واحد تھا۔ جس کا مطلب تھا۔ "کہ تم بچپن میں مجھے اپنا شوہر تسلیم کر چکی ہو۔ اب کسی دوسرے کی نہیں ہو سکتیں۔

اس عبارت سے مجھ پر عیاں ہو گیا۔ کہ یہ برلاس ہی کی تباہ کاریاں ہیں۔ جو دیگر سامان کے ساتھ کنوئیں سے نکالا جا چکا ہے۔ اب میرے لئے یہ معمّہ حل طلب تھا۔ کہ برلاس کہاں ہے۔ اور کس شکل وصورت میں ہے۔ پنڈت جی نے کنوئیں کے سامان کی جو فہرست مجھے دی تھی۔ ضائع ہو چکی تھی۔ وہ خود بھی زندہ نہ تھے۔ کہ ان سے سراغ ملتا۔

آخر کار میں نے اس سلسلہ میں لاہور کا سفر کیا۔ اور اپنی دی ہوئی چیزیں عجائب گھر میں جا کر دیکھیں۔ مگر ان میں کوئی چیز ایسی نہ دکھائی دی۔ جس پر راکھشش کا گمان کیا جا سکتا۔

اب اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ کہ کملا کو شادی پر رضامند کیا جائے

اور اس ترکیب سے راکھشش کو رقیب بن کر دیکھا جائے۔ ایک دن میں نے موقع پاکر کملا سے اپنی محبت کا اظہار کر دیا۔ چونکہ وہ بھی مجھے چاہتی تھی اس لئے اس نے شادی کا وعدہ کر لیا۔

اس کے بعد مجھے اپنی جان کی فکر ہوئی۔ سو میں نے اس منتر کو جو تانبے کی چادر پر کندہ تھا۔ کاغذ کے ٹکڑوں پر تعویز کی طرح لکھ کر ایک ایک تعویز بالاخانے کے سب دروازوں پر لگا دیا۔ اور ایک اپنے گلے میں باندھ لیا۔ جس شام زرینہ اور عزیز ہمیں جھروکے سے دیکھ رہے تھے میں جس چیز کا معائنہ کر رہا تھا وہ راکھشش کا ایک اور پرچہ تھا۔ جواب کی مرتبہ کملا کو ملا تھا۔

جب تک ہم دونوں کمرے میں کھڑے رہے راکھشش باہر جھروکے سے ہمیں دیکھ کر دانت پیستا رہا۔ اور اندر نہ آسکا۔ کیونکہ تمام دروازوں پر تعویذ لگے ہوئے تھے۔ اس شام زرینہ اسی راکھشش کو دیکھکر بیہوش ہو گئی تھی۔

آج رات برلاس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ اس کا غرور خاک میں مل رہا تھا۔ میں نے اور سب دروازوں پر وہی تعویذ لگا دیئے تھے۔ لیکن سامنے والی دیوار میں چور دروازے کا مجھے علم نہ تھا۔ یہ راستہ اس کے لئے کھلا تھا۔ اس نے اس چور دروازے کے ذریعے اندر آکر

دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دبانے کی کوشش کی۔ مگر اس تعویذ کی برکت سے اس کے ہاتھ وہیں شل ہو گئے۔ اور وہ گر پڑا۔ جس کے بوجھ سے دب کر میں نیم جان سا ہو گیا۔ باقی سب حالات آپ کو معلوم ہیں۔

دوسرے دن انہیں سلوں کا چبوترہ معمار سے بدستور بنوا دیا گیا۔ اور ایک سل پر بھائی جان نے اردو میں اس کنوئیں کو کھولنے کی ممانعت کندہ کر دی۔

اسی اثنا میں مجھے عزیزہ سے کافی اُنس ہو گیا تھا۔ چنانچہ میری شادی اس سے ہو گئی اور ہم سب نے اس حویلی کو خیرباد کہہ دیا۔

اب بھی اگر کوئی سیاح موضع مرادیانی کی طرف جا نکلے تو وہ اس چبوترے کو جس کے نیچے راکھشش دفن ہے موجود پائے گا۔ لیکن میں اُسے متنبہ کرتی ہوں کہ وہ ہرگز اس چبوترے کو کھدوانے کا قصد نہ کرے ورنہ گرفتارِ بلا ہو جائے گا۔

مُعلّم کا راز

حسن میرے بچوں کا معلّم علم و فضل میں یکتا تھا۔ نہایت محنت اور تندہی سے بچوں کو تعلیم دیتا تھا۔ اس میں دیگر معلموں کی طرح رعونت اور خود پسندی نام کو نہ تھی۔ اس لئے وہ ہمارے خاندان میں بہت جلد ہر دلعزیز ہو گیا۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ دبلا پتلا لمبے قد کا آدمی تھا۔ اس کا رنگ بالکل سرسوں کے پھول کی طرح زرد تھا۔ چہرے کے خدوخال جو کسی زمانے میں موزوں اور دلفریب ہوں گے۔ بگڑ چکے تھے۔ گال پچکے

ہوئے اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی - لاغری کی وجہ سے پیشانی حد سے زیادہ چوڑی اور کان بہت لمبے لمبے دکھائی دیتے تھے - مگر ان تمام نقائص کے باوجود اس کے چہرے پر ملاحت ضرور تھی - بچے اس سے محبت کرتے تھے وہ بھی بچوں کو دل سے چاہتا تھا - جہاں اس میں یہ سب خوبیاں تھیں وہاں ایک عیب بھی تھا - وہ یہ کہ قمری مہینے کے آخری تین چار دن وہ ضرور رخصت پر گذارتا -

جب وہ رخصت کے دن گذار کر واپس آتا - تو اس کی حالت بہت خراب ہوتی - شکل و صورت بھی بالکل ڈراؤنی ہو جاتی تھی - ہمیں اس کی عجیب و غریب عادت اور بدتر حالت پر تعجب ہوا کرتا -

ساون کا مہینہ تھا - میری ملازمہ صبح سویرے وضو کرنے باہر نل پر گئی - اس نے دیکھا کہ عشق پیچاں کی بیل کے نیچے ایک کالا پھن دار سانپ رینگتا ہوا جا رہا ہے - ملازمہ نے شور مچایا - اس کی آواز پر دوسرے ملازم لاٹھیاں لے کر آ پہنچے - لیکن اتنے عرصہ میں سانپ نوکروں کے گھروں سے آگے بڑھ کر حسن کے کمرے کی طرف چلا گیا اور ایک نالی کے ذریعے اس میں داخل ہو گیا -

حسن کا کمرہ مقفل تھا - کیونکہ اسے رخصت پر گئے دوسرا دن تھا - اب اگر سانپ کو یونہی چھوڑ دیا جاتا تو خطرے سے خالی نہ تھا - اس لئے یہ صلاح

ٹھہری کہ قفل توڑ کر سانپ کو مار دیا جائے۔

قفل توڑ کر جب لوگ اندر داخل ہوئے تو ان کے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ حسن چارپائی پہ اوندھے منہ پڑا تھا۔ اس کی بند آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ منہ سے کف جاری تھا۔ اس کا داہنا ہاتھ نیچے لٹک رہا تھا جیسے سانپ نے ابھی ابھی کاٹا تھا۔

سانپ مار دیا گیا۔ اور حسن کو ہم نے ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ حسن کے متعلق ہم لوگوں کو بڑی الجھن تھی۔ مگر وہ جلدی صحتیاب ہو گیا۔ آخر حسب معمول وہ چھٹے دن اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا۔ اسے دیکھتے ہی سب نے طرح طرح کے سوالوں کی بوچھار کر دی۔ مگر اس نے کسی بات کا جواب نہ دیا۔ لیکن جب میں نے زیادہ مُصر ہو کر اس عجیب وغریب راز سے آگاہ ہونا چاہا۔ تو وہ بولا "یہ ایک بڑی اندوہناک داستان ہے جو میں بچوں کے سامنے بیان نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ شاید اس راز سے آگاہ ہو کر ڈر جائیں اور مجھ سے نفرت کرنے لگیں۔

(۲)

رات کا وقت تھا۔ آم کے درخت پر کوئل اپنی دردناک آواز میں کوک رہی تھی۔ حسن ایک تخت پر بیٹھا اپنی داستان سنا رہا تھا۔

میرا نام حسنات احمد ہے میں ریاست جموں کے موضع اکھنور کا رہنے والا ہوں۔ میرے دادا گاؤں کے چودھری تھے ہماری کاشتکاری وسیع پیمانے پر ہوتی تھی۔ میرا باپ بچپن ہی میں فوت ہو چکا تھا۔ دادا ہی میرے اور میری بیوہ ماں کے کفیل تھے۔ میرے چچا تحصیلدار تھے۔ دادا کو میرے باپ سے بہت محبت تھی اور مجھے ان کی نشانی سمجھ کر چاہتے تھے۔ میرے چچا کی ایک لڑکی تھی۔ جس کا نام سکینہ تھا۔ یہ مجھ سے چار سال چھوٹی تھی۔

ہمارا مکان موضع اکھنور سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک فردوس نما خطۂ ارضی میں واقع تھا۔ جس کے اردگرد کئی ایکڑ زمین ہماری ملکیت تھی۔ ہمارا مکان بہت وسیع اور شاہانہ طرز کا بنا ہوا تھا۔ اس میں کئی ایک ڈیوڑھیاں۔ غلام گردشیں۔ بخالچے اور آڑے ترچھے کمرے بنے ہوئے تھے۔

مکان کے اردگرد ہمارا شاندار باغ تھا جو کئی بیگھوں میں پھیلا ہوا تھا۔ اسمیں جابجا چھوٹی چھوٹی نہریں جاری تھیں۔ جو پاس کی ایک پہاڑی ندی سے کاٹ کر لائی گئی تھیں۔ باغ سے آگے نکل کر ایک عظیم الشان اراضی میں جہاں تک نظر کام کرتی تھی زعفران اور دھان کے کھیت ہوا میں لہراتے دکھائی دیتے تھے دائیں بائیں ہارسنگار کے درختوں کا سلسلہ

میلوں تک چلا گیا تھا۔ پچھواڑے کی طرف ندی کے کنارے میرے دادا نے ایک کنال زمین میں بانس کے درخت لگوا رکھے تھے۔ یہ درخت اتنے گھنے اور سرسبز تھے کہ یہ تھوڑی سی زمین بانسوں کا اچھا خاصہ جنگل معلوم ہوتی تھی۔

اس عالیشان گھرانے میں میں اور سکینہ ہی صرف دو بچے تھے جو دنیا کے دوسروں سے الگ امن اور چین کی اس بستی میں پرورش پا رہے تھے۔ میری اور سکینہ کی آپس میں بڑی محبت تھی۔ ہم دونوں کی تعلیم کے لئے ایک معلم کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ جب میں نے جموں جا کر مڈل کا امتحان دیا میری عمر سولہ سال کی تھی۔ جب نتیجہ نکلا تو سب لڑکوں میں میرا نمبر اول تھا۔ اب چچا کی رائے تھی کہ مجھے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے جموں بھیج دیا جائے۔

میرے جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مجھے اپنے عزیز و اقارب اور خصوصاً سکینہ کی جدائی بہت شاق تھی۔ میرا دل اندر ہی اندر بیٹھا جاتا تھا۔ سکینہ بھی بہت مغموم نظر آتی تھی۔ میری اور سکینہ کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ وہ بسورر رہی تھی کہ "میں بھیا کو نہ جانے دوں گی" دادا اس کو دلاسا دے رہے تھے۔ میں خود پریشان تھا۔ مگر میں نے بڑے ضبط سے کام لیا۔ اور بادلِ ناخواستہ ان لوگوں سے رخصت ہوا۔

(۳)

دو سال گذر گئے۔ میں کئی دفعہ چھٹیوں میں گھر آیا۔ مگر سکینہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ کیونکہ اکثر ایسا اتفاق ہوتا رہا کہ اس موقع پر یا تو وہ ننھیال گئی ہوتی یا اپنے باپ کے پاس اودھم پور۔

آخر جب میں میٹرک کا امتحان دے کر گھر آیا تو سکینہ وہاں موجود تھی اُسے دیکھ کر میری آنکھوں میں بجلی سی کوند گئی۔ میں بھونچکا سا رہ گیا۔ دو سال کے قلیل عرصہ میں وہ کچھ سے کچھ ہو گئی تھی۔ اب وہ بجائے ایک معصوم اور شوخ لڑکی کے ایک سنجیدہ اور شرمیلی دوشیزہ تھی۔ وہ حسن اور رعنائی کا شاداب پھول تھی۔ اس کی چشم غزالیں میں غضب کا جادو تھا۔ نقش بھی بہت دلکش تھے۔ کاکلِ مشکیں پر مارِ سیاہ کا دھوکا ہوتا تھا۔ بوٹا سا قد اور گدرایا ہوا بدن محشر بپا کر رہا تھا۔ اس کے لاثانی حسن میں ایک مقناطیسی کشش تھی۔ جس سے میں مسحور ہو گیا۔ اور مجھے اس کو مخاطب کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

وہ نگاہیں نیچی کئے خاموش بیٹھی تھی۔ لیکن کبھی کبھی کنکھیوں سے میری طرف دیکھ لیتی۔ وہ بہت خوش معلوم ہوتی تھی۔ اس کے گال تمتما رہے تھے۔ وہ مجھ سے باتیں کرنے کی متمنی تھی۔ مگر باوجود انتہائی کوشش کے

میں زبان نہ ہلا سکا۔ چند دنوں میں ہماری ہچکچاہٹ دور ہو گئی اور میں محسوس کرنے لگا کہ سکینہ میرے دل کی گہرائیوں میں اتری جا رہی ہے

ایک دن دوپہر کے وقت میں باہر مردانے میں سو رہا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ دادا اور چچا ایک طرف بیٹھے کچھ باتیں کر رہے تھے۔

دادا۔ بیٹا اب میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں۔ نہ جانے کس وقت وعدہ پورا ہو جائے۔ مجھے حسرت ہے کہ حسنات کا سہرا دیکھ لوں۔

چچا۔ ابا جان میرا ارادہ ہے کہ حسنات کو اعلیٰ تعلیم دلواؤں۔ اگر ابھی اس کی شادی کر دی گئی تو تعلیم سے محروم رہ جائے گا۔ دوسرے سکینہ ابھی نادان ہے۔ تین چار سال کوئی بڑی بات نہیں۔

اس سکینہ سے میری شادی؟ میری رگ و پے میں شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ مگر آنکھیں بند کئے چپکا پڑا رہا۔ دادا اور چچا دیر تک اس امر پر بحث کرتے رہے۔

خوشی کے دن چشم زدن میں گذر جاتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد مجھے علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ اب میرے اور سکینہ کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن چند ماہ بعد اس کے خط دیر سے آنے لگے۔ اور پھر رفتہ رفتہ بالکل بند ہو گئے۔

(۴)

گرمی کی چھٹیوں میں جب میں گھر آیا۔ تو وہ مجھے ملی۔ مگر بہت سرد مہری سے۔ میں اس کی بے رُخی پر بہت حیران تھا۔ لیکن اس کی کوئی وجہ معلوم نہ ہو سکی۔

دن گذر چکا تھا۔ آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ آسمان پر سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ ہار سنگار کے درختوں پر سورج کی آخری کرنیں پڑنے سے تمام جنگل شعلہ جوالہ بن رہا تھا۔ سکینہ باغ کے سرے پر دیوار کے قریب کھڑی تھی ہار سنگار کے نارنجی پھولوں کا عکس اس کے رُخِ زیبا پر عجیب بہار دیتا تھا۔ وہ جنگل کا پُرکیف نظارہ دیکھنے میں محو تھی۔ اس کی گود میں ہرن کا ایک ننھا سا بچہ تھا اور ہاتھ میں شیشے کی بوتل تھی۔ جس سے وہ ہرن کے بچے کو دودھ پلایا کرتی تھی۔

اس وقت اس کا حسن حورانِ بہشتی کو مات کر رہا تھا۔ مجھ سے نہ رہا گیا دبے پاؤں اس کے پاس جا کھڑا ہوا "سکینہ" میں نے کہا۔

سکینہ۔ (بغیر میری طرف دیکھے) حسن دیکھو کیا اچھا سماں ہے۔

میں۔ لیکن تم سے زیادہ حسین نہیں۔

سکینہ۔ ایسی بیہودہ باتیں مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔

میں۔ میں دیکھتا ہوں کہ میرے ساتھ تم بہت بے اعتنائی سے پیش آتی ہو۔

سکینہ۔ یہ تمہارا وہم ہے

میں۔ نہیں اس سے پہلے تمہیں میرے ساتھ بہت محبت تھی۔

سکینہ۔ محبت سے کس کو انکار ہے۔خون کی محبت تو قدرتی ہوتی ہے مگر تم اس محبت کو اور ہی رنگ دینا چاہتے ہو۔

سکینہ کے منہ سے یہ باتیں سن کر مجھے رنج ہوا۔حتیٰ کہ میں نے رات کا کھانا بھی نہ کھایا۔ اور چارپائی پہ پڑا رہا۔چاندنی رات تھی۔ہوا کے نرم اور خوشگوار جھونکے راحت پہنچا رہے تھے۔باغ کا پتہ پتہ خوشبو میں بسا تھا۔سب دنیا محوِ خواب تھی۔مگر مجھے نیند کہاں۔میں بےچینی سے کروٹیں لے رہا تھا۔

بارہ بجے کے قریب مجھے دروازے کی چرچراہٹ سنائی دی میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو سنتھے کی باڑ کے پیچھے سایہ سا دکھائی دیا۔میں بہت حیران تھا۔کہ آدمی رات کو گھر سے باہر کون جا رہا ہے آخر کھوج لگانے کے لئے اٹھا اور درختوں کے سائے میں اپنے آپ کو چھپاتا چپ چاپ تعاقب میں روانہ ہوا۔

جانے والا بہت دھیمی چال سے چل رہا تھا جب میں اس کے

کچھ قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ سکینہ ہے وہ بانس کے جنگل کے قریب جا کر رک گئی۔ اور میں ایک درخت کے پیچھے اسے چھپ کر دیکھنے لگا۔ اتنے میں بانس کی ڈالیاں ہٹیں اور ایک نوجوان جس کے مقابلے میں چاند کا حسن بھی پھیکا تھا نکلا اور اس کے سامنے کھڑا ہو کر کہنے لگا۔

نوجوان۔ آہ سکینہ آج کئی دن کے بعد تم سے ملاقات ہوئی۔

سکینہ۔ رفیق میں آج آخری دفعہ تمہیں ملنے آئی ہوں۔

نوجوان سکینہ خدا کے لئے ایسا نہ کہو۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

سکینہ۔ میں مجبور ہوں۔ کیونکہ میں عنقریب اپنے چچا کے لڑکے سے بیاہی جانے والی ہوں۔ اور میرے والدین کی یہی مرضی ہے۔

نوجوان۔ اچھی سکینہ ایسی دل شکن باتیں زبان سے نہ نکالو۔ اور بتاؤ کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟

سکینہ۔ اگر محبت نہ ہوتی تو رات کے وقت ایسی جگہ کیا کرنے آتی۔

یہ کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میری رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ آخر کار کچھ دیر کے بعد وہ واپس آ گئی

مجھے سکینہ سے سچی محبت تھی۔ اس لئے میں نے دل سے عہد کرلیا کہ میں اسکی خوشی کو اپنی خواہشات پر قربان نہ کروں گا۔

چنانچہ میں اپنے کمرے میں گیا۔ اور دادا کے نام ایک خط لکھا۔

"میں نے سنا ہے کہ میری شادی سکینہ سے ہونے والی ہے اسی وجہ سے میں گھر چھوڑ رہا ہوں میں لکیر کا فقیر نہیں ہوں کہ آپ کے دقیانوسی خیالات کے مطابق ایک دیہاتی لڑکی سے شادی کر کے اپنی زندگی تباہ کر لوں"۔

رقم حسنات احمد

یہ خط ایک لفافے میں بند کر کے میں نے اپنے سرہانے رکھ دیا اور خود ایک پرانے دوست کے پاس پشاور چلا گیا۔ جہاں اس نے مجھے ایک پٹھان سردار کی جائیداد کی دیکھ بھال کے لئے بتیس روپے ماہوار پر ملازم کرا دیا۔

ایک سال تک میں نے خوب محنت سے کام کیا۔ سردار صاحب مجھ پر بہت مہربان تھے میرا ارادہ تھا کہ اپنی تعلیم جاری رکھوں۔ انہوں نے مجھے اس کی اجازت دے دی اور فیس وغیرہ کا خرچ بھی اپنے ذمہ لے لیا ——— غرضیکہ میں اپنی ڈیوٹی کے ساتھ تعلیم بھی حاصل کرنے لگا۔

(۵)

اس واقعہ کو چار سال گذر گئے اب میں بی۔اے پاس کر چکا تھا۔ شام کے قریب میں قصہ خوانی بازار سے گذر رہا تھا۔ کہ کسی نے میرا نام لے کر پکارا۔ میں نے دیکھا تو میرے گاؤں کا ایک آدمی تھا۔ میں نے اس سے اپنے عزیزوں کی خیر و عافیت دریافت کی تو معلوم ہوا کہ چچا مر چکے ہیں اور چار سال کا عرصہ ہوا کہ سکینہ کی شادی رفیق نامی ایک امیرزادے سے ہو گئی ہے جو آجکل لکھنور کے قریب ہی جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس نے بتایا۔ کہ دادا کی صحت خراب ہو چکی ہے اور مجھے یاد کر کے اکثر روتے رہتے ہیں۔ چچا کے انتقال کا مجھے از حد صدمہ ہوا۔ اور بڈھے دادا کی افسوسناک حالت سن کر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں گھر چلا آیا۔

مجھے دیکھ کر دادا گویا از سرِ نو زندہ ہو گئے۔ انہوں نے مجھ سے آوارگی کی وجہ پوچھی۔ تو میں نے سکینہ اور رفیق والا سارا معاملہ انہیں سنا دیا۔ وہ میرے ایثار اور نیک نیتی سے بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے مجھے اشارے سے سکینہ کا وہ عالیشان محل دکھایا۔ جو ہاڑسنگا کے خوبصورت جنگل میں کھڑا آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔

میرے آنے کی خبر گرد و نواح میں ایک دم پھیل گئی۔ لوگ میری

ملاقات کو آنے لگے۔ دوپہر کے قریب سکینہ بھی آئی۔ جسے دیکھ کر میرا دل بجھ گیا۔ اس کا شہابی رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ اور وہ بالکل ہڈیوں کی مالا بن رہی تھی۔

"آہ سکینہ تمہیں کیا ہوا؟" میری زبان سے بے اختیار نکلا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے اس کے زرد رخساروں پر ڈھلکتے نظر آئے۔ جنہیں دیکھ کر میرا دل بہت آزردہ ہوا۔ اور مجھے شک ہوا کہ شاید رفیق اس سے بدسلوکی کرتا ہے لیکن سب نے رفیق کی تعریف کی۔

دوسرے دن سکینہ کے گھر میری دعوت تھی۔ میں نے دادا سے عذر کیا۔ کہ رفیق مجھے ملنے نہیں آیا۔ اور شاید ابھی تک مجھے اپنا رقیب خیال کرتا ہے میں وہاں نہ جاؤں گا۔ دادا نے کہا "تمہارا یہ خیال فضول ہے رفیق تو گوشہ نشین آدمی ہے اور شاذ و نادر ہی گھر کی چار دیواری سے باہر نکلتا ہے۔

سہ پہر کو میں اور دادا سکینہ کے گھر گئے۔ سکینہ کا مکان ایک ایسے خوبصورت باغ میں بنایا گیا تھا جس کا نظارہ بے حد دلفریب تھا صحنِ چمن پر بلا کا نکھار تھا۔ سرو و صنوبر کے خوشنما درخت اپنی موزونی قامتی پر مغرور نہایت شان و شوکت سے ایستادہ تھے۔ باغ کی کانٹ چھانٹ

کسی کاریگر نے کمال کی شاہد تھی۔ بیگوں جو منوں میں دلآویز فوارے چھوٹ رہے تھے۔ چمن پھولوں سے پٹے ہوئے تھے۔ دلربا کشادہ روشوں کے گرد لالہ زار کھلا تھا۔ مکان اپنی انوکھی طرز تعمیر اور قیمتی فرنیچر اور دیگر آرائشی سامان کے لحاظ سے بالکل قصر شاہی معلوم ہوتا تھا۔

سکینہ نے مجھے اپنے مکان کا کونہ کونہ دکھایا پھر رفیق سے ملاقات ہوئی۔ درحقیقت رفیق نہایت ملنسار اور خلیق آدمی تھا۔ اس مختصر ملاقات ہی سے میں اس کا گرویدہ ہو گیا۔ اور اس دن سے روزانہ سکینہ کے گھر جانے لگا۔ مجھے رفیق کے بغیر چین ہی نہ آتا تھا۔ انہیں ایام میں سکینہ کے طرز عمل سے مجھ پر یہ ثابت ہو گیا کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے ناخوش ہے۔ مجھے تعجب ہوتا تھا کہ وہ اتنی افسردہ کیوں رہتی ہے مگر یہ راز کھل نہ سکا۔

رفیق تنہائی پسند تھا سوائے چند خاص آدمیوں کے کسی سے میل جول نہ رکھتا تھا۔ علاوہ خوبیوں کے اس میں دو نقص بھی تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ موسیقی سے سخت نفرت کرتا تھا۔ دوسرے درویشوں اور سنیاسیوں کا سخت ترین دشمن تھا۔ سو یہ وجہ کوئی ایسی اہم نہ تھی کہ سکینہ کی رنجیدگی کا باعث ہوتی میں اکثر خیال کرتا شاید سکینہ کو مجھ سے بچھڑ جانے

قائم ہے۔

(۶)

سردیوں کا موسم تھا۔ اپالو دیوتا کی نورانی کشتی فلک کے نیلگوں سمندر کے عین منجدھار میں پہنچ چکی تھی۔ اس کی فیض رسانی سے کائنات کا ذرہ ذرہ سیل نور میں غرق ہو رہا تھا۔ یہ جانفزا سماں دیکھ کر فرطِ انبساط سے دل کی کلی خود بخود کھل رہی تھی لیکن رفیق کو ان نیرنگیوں سے کچھ لگاؤ نہ تھا۔ وہ اپنے پُر تکلف کمرے میں آتشدان کے قریب ایک صوفے پر بڑے وقار سے بیٹھا تھا۔ سامنے ایک سیاہ آبنوسی میز پر چند کتابیں پڑی تھیں جن کے مطالعہ میں وہ اکثر محو رہتا تھا۔ میں اور سکینہ باغ میں ٹہل رہے تھے۔ پگڈنڈی پر ایک سپیرا جا رہا تھا۔ سکینہ نے سانپ کا کھیل دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ ابھی سپیرے نے بین ہی بجانا شروع کی تھی کہ رفیق بھاگتا ہوا موقع پر پہنچ گیا اور بیچارے سپیرے کو مار مار کر بھگا دیا۔ میں اپنی بے وقوفی پر شرمسار ہو گیا۔ لیکن سکینہ نے بہت بُرا مانا۔

سکینہ۔ رفیق تمہاری یہ حرکت بہت ہی قابلِ نفرت ہے۔ تمہیں میری تفریح میں رکاوٹ ڈالنے کا کیا حق ہے۔ چاہے تم ان باتوں کو پسند نہ کرو۔ مجھے تو کھیل تماشے بہت بھاتے ہیں۔ اپنی اپنی طبیعت ہوتی ہے

رفیق۔ پیاری! یہ لوگ بہت ہی خطرناک ہوتے ہیں۔ حسینوں کا حسن چرا لیتے ہیں۔ نوجوانوں کو بوڑھا کر دیتے ہیں۔ بہادروں کا خون چوس لیتے ہیں۔ اور عاشقوں کی زندگیاں تباہ کر دیتے ہیں۔ تم کیا جانو ان کا جادو بڑا سخت ہوتا ہے۔

وہ یہ کہتے ہوئے ہم دونوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا جاتا تھا۔ یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرا دل خود بخود اس پر مائل ہو رہا ہے سکینہ کو بھی اپنی حرکت پر پشیمانی ہونے لگی۔ وہ بے اختیار اس سے بغلگیر ہو گئی۔ رفیق نے اُسے نہایت محبت سے گلے لگایا۔ پھر وہ ہم دونوں کو اندر لے گیا۔ اور بڑی نرمی سے دیر تک نصیحتیں کرتا رہا۔

شام کے قریب جب میں گھر واپس آیا۔ تو مجھے یوں محسوس ہوا۔ گویا کسی نشے کا خمار اُتر رہا ہے کسلمندی سے میرا بدن چُور ہو رہا تھا۔ میں بستر میں پڑ کر اپنی حالت پر غور کرنے لگا۔ کہ کس طرح سکینہ رفیق کی بے جا سختی پر مشتعل ہوئی اور میں بھی بیزار ہوا۔ مگر اس کے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے سے ہمارے دل موم کی طرح پگھل گئے۔ شاید وہ ہپناٹزم جانتا ہے۔ یا اس کی آنکھوں میں کوئی شیطانی قوت ہے۔

اس واقعہ کے بعد مجھے رفیق سے نفرت سی ہو گئی۔ لیکن جب اس کے سامنے جاتا دفعتہً میرے سینے میں اس کی محبت کا سمندر موجزن ہو جاتا

اور میں ایک پالتو کتے کی طرح اس کے ادنیٰ اشاروں پہ چلنے لگتا۔

ایک دن علی الصبح میں اپنے باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ کہ ایک شخص سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ اس نے ایک موٹا سا کپڑا سر پہ اس طریقے سے باندھ رکھا تھا۔ جس سے اس کا چہرہ پوری طرح دکھائی نہ دیتا تھا وہ آتے ہی کہنے لگا۔

"حضور مجھے ایک عرض کرنا ہے کسی تخلیئے کی جگہ پر میری بات سنیئے"

یہ فقرہ کچھ اس انداز سے کہا۔ کہ میں اس کی درخواست کو رد نہ کر سکا اور اُسے ساتھ لئے بانسوں کے جنگل تک چلا گیا۔ اب اس شخص نے منہ سے کپڑا ہٹایا اور میں نے اِسے پہچان لیا یہ وہی سپیرا تھا۔ جس کی اس دن رفیق نے گت بنائی تھی۔

سپیرا۔ حضور میں اس دن والے صاحب کے متعلق چند ضروری معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہ کریں گے۔

میں۔ ان کے متعلق صرف اتنا جانتا ہوں۔ کہ وہ ایران کے جلاوطن امیرزادے ہیں۔ اور میرے چچا کی لڑکی ان سے بیاہی گئی ہے۔

سپیرا۔ یہ تو میں لوگوں سے سن چکا ہوں۔ لیکن کیا کوئی غیر فطری قوت بھی آپ نے ملاحظہ کی ہے؟

میں۔ ہاں اُن کی آنکھوں میں کوئی کشش ضرور ہے۔

سپیرا۔ وہ آنکھیں جھپکتے بھی ہیں یا نہیں؟

میں۔ اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ میں نے اس طرف کبھی دھیان نہیں دیا۔ مگر تمہیں ان پر کیا شبہ ہے۔ کیا تم انہیں جادوگر سمجھتے ہو؟

سپیرا۔ (ہنس کر) نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اچھا آج آپ اُن کی آنکھوں کا معائنہ کریں۔ میں شام کو پھر حاضر ہوں گا۔

(۷)

دس بجے کا وقت تھا۔ بادِ خنک کے تھپیڑے آفت برپا کر رہے تھے میں تیز رفتاری سے چلتا ہوا سکینہ کے مکان میں داخل ہوا۔ اتفاقاً کسی ملازم وغیرہ نے مجھے آتے نہ دیکھا۔ میں دبے پاؤں رفیق کے کمرے میں جا کر پردے کے پیچھے چھپ گیا۔

رفیق اس وقت ایک صوفے پر بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ سکینہ کھلی ہوئی کھڑکی کے قریب ایک چوکی پر بیٹھی سلائیوں سے کچھ بن رہی تھی۔ اس نے بالکل سادہ اور سفید لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے خوبصورت دراز گیسوؤں کو بادِ تند کے گستاخ جھونکے اس کے حسین چہرے پر بکھیر رہے تھے۔

رفیق بظاہر سگار نوشی میں مشغول تھا۔ مگر اس کی آنکھیں سکینہ کے چہرے

پہ گڑی ہوئی تھیں۔ میں دیر تک اس کی آنکھوں کو غور سے دیکھتا رہا اور یہ معلوم کر کے کہ درحقیقت رفیق آنکھ نہیں جھپکاتا۔ مجھ پر خوف سا طاری ہو گیا۔ پھر میں نے سکینہ کو غور سے دیکھا۔ تو وہ غنودگی کی حالت میں بیٹھی تھی۔ گو اس کے ہاتھوں میں سلائیاں تھیں۔ لیکن اس کی انگلیوں میں حرکت مفقود تھی۔ میں بدحواس ہو کر چپکے سے باہر نکل آیا۔

شام کے قریب سپیرا مجھے پھر ملا اور کہنے لگا "حضور بتائیے کچھ پتہ چلا؟"

میں - ہاں آج مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ وہ آنکھ نہیں جھپکاتا۔ اب کیا کیا جائے؟

سپیرا - حضور میں کوئی اسم پڑھنا چاہتا ہوں۔ کوئی مضبوط سے دروازے کا کمرہ ان کے مکان میں مل جائے، تو آپ کو اپنی فقیری کے کمالات دکھاؤں۔ صرف جگہ کی ضرورت ہے۔ خواہ باہر علیحدہ ہی کوٹھڑی ہو۔ لیکن اس قدر نزدیک ہو۔ کہ میری آواز اس کے کانوں تک پہونچ سکے۔

میں - کسی نوکر کے گھر میں تو ایسی جگہ آسانی سے مل سکتی ہے۔

سپیرا - لیکن وہاں تو ملازموں کے خلل انداز ہونے کا اندیشہ ہے۔

میں - فکر نہ کرو۔ کل شام کو لکھنؤ میں میلہ ہے اور تمام ملازم وہاں

جانے والے ہیں۔

سپیرا یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ اور دوسری شام کو آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا۔ صبح سویرے ہی میں سکینہ کے گھر گیا۔ وہ لوگ ابھی بستروں میں آرام کر رہے تھے۔ میں نوکروں کے گھر دیکھتا بھالتا رہا ان میں ایک کوٹھڑی سپیرے کی ہدایت کے مطابق بہت موزوں تھی اس میں کوئی کھڑکی یا روشندان وغیرہ نہ تھا اور دروازہ بہت مضبوط تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں واپس چلا آیا۔

رات کو بانس کے جنگل میں سپیرا میرا انتظار کر رہا تھا۔ ہم دونوں سکینہ کے مکان کی طرف ہو لیے۔ قمری مہینے کی ستائیسویں رات تھی تاریکی کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ سردی کی شدت سے یہ خطہ کرۂ زمہریر بنا ہوا تھا۔ مگر میری پیشانی خوف سے عرق آلود ہو رہی تھی۔

اگرچہ میں نے چلتے وقت احتیاطاً پستول بھر کر جیب میں رکھ لیا تھا۔ پھر بھی میری ٹانگیں دہشت سے لڑکھڑا رہی تھیں۔ لیکن میں گرتا پڑتا وہاں تک پہونچ گیا۔ یہاں مکمل سکوت تھا۔ رات کے سناٹے میں وہ مکان نہایت ڈراؤنا اور ہیبت ناک معلوم ہوتا تھا۔ گرد و نواح میں بھی ہر طرف خاموشی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ البتہ کسی وقت دور کے کسی گاؤں سے کتوں کے بھونکنے کی مدھم سی آواز سنائی دیتی تھی۔ ہم دونوں

کوٹھڑی میں داخل ہوئے۔ سپیرے نے اندر سے کنڈی لگا لی۔ پھر اپنے بقچے سے ایک مٹی کا دیا نکال کر جلایا اور کوٹھڑی کے عین درمیان زمین کو کچی مٹی سے لیپ کر اس کے گرد دائرہ کھینچا اور ہم دونوں اس میں بیٹھ گئے۔

میں چپ چاپ اس کی حرکات دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے ایک خوشبودار مصالحہ سا سلگایا۔ اور ایک عجیب قسم کے ساز پر کسی خاص زبان میں کچھ گانا شروع کیا۔ اور پندرہ بیس منٹ تک یہی راگ الاپتا رہا۔ یکایک دروازے پر زور سے دھکا لگا۔ اور ساتھ ہی رفیق کی نہایت کرخت آواز سنائی دی " یہاں کون مردود طوفان بدتمیزی مچا رہا ہے۔ جلدی دروازہ کھولو "

میں کانپ اٹھا مگر سپیرے نے کچھ پروا نہ کی۔ وہ اپنے کام میں مشغول رہا۔ دروازے پر زور زور سے دھکے پڑ رہے تھے اور رفیق گلا پھاڑ پھاڑ کر گالیاں دے رہا تھا۔ وہ غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ جب اسے دروازہ توڑنے میں مایوسی ہوئی تو تنگ آ کر کہنے لگا " اگر تم دروازہ نہ کھولو گے تو میں کوٹھڑی کو آگ لگا دوں گا۔ اور تم جل بھن کر خاک ہو جاؤ گے "

سپیرے پر اس دھمکی کا بھی اثر نہ ہوا۔ البتہ اس نے ساز رکھ دیا اور بین اٹھا کر بجانا شروع کی۔ رفیق کو جب یقین ہو گیا کہ سختی سے کام نہ چلے گا تو گڑگڑا کر کہنے لگا ــــــ

"خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو"

مگر سپیرا اس سے مس نہ ہوا۔ رفیق ہماری ہٹ دھرمی سے مایوس ہو کر ادھر ادھر دوڑنے لگا معلوم ہوتا تھا۔ کہ باہر گھوڑ دوڑ ہو رہی ہے۔

چند منٹ ایسا کرنے کے بعد وہ پھر دروازے کے پاس آکر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا "ظالم میری بربادی سے تجھے کیا حاصل ہوگا؟"

یہ کہتے ہوئے نہایت دردناک آواز میں گریہ و زاری کرنے لگا سپیرا زور شور سے بین بجاتا رہا۔ رفتہ رفتہ رفیق کی آواز بند ہو گئی۔

یکایک میں نے دیکھا کہ سپیرے کی پشت کی جانب کونے میں سے نالی کے ذریعے ایک بے حد موٹا سا پھندار سانپ اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی میری روح فنا ہو گئی لیکن میں نے دل کڑا کر کے اس پر پستول فائر کیا۔ سپیرے کے اوسان خطا ہو گئے۔ بین اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اور پھٹے پھٹے دیدوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے ہاتھ سے سانپ کی طرف اشارہ کیا۔ جب سپیرے نے ادھر دیکھا تو اسے اژدھا دم توڑتا ہوا دکھائی دیا

سپیرا۔ (سر پیٹ کر) آہ! آپ نے ظلم کیا۔

میں۔ تو کیا یہ تمہارا پالتو سانپ تھا؟

سپیرا۔ یہ تو رفیق صاحب تھے آہ ان کا بہت بُرا حشر ہوا۔

میں۔ (کانپ کر) ہائیں رفیق ــــ یہ کس طرح ؟

سپیرا۔ (غمگین لہجے میں) سانپ جب سو سال کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو اسے اپنی ہیئت تبدیل کرنے پر قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ میں اس عجیب و غریب انکشاف پر ہکا بکا سانپ کی طرف دیکھنے لگا اور بعد ازاں ڈرتے ڈرتے اس کے قریب گیا۔ اس نے یک دم اپنی بے نور آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ اور اپنا زخمی سر اٹھا کر مجھ پر جھپٹنے کی کوشش کی لیکن کمزوری سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اور وہیں گر کر ڈھیر ہو گیا خون کی باریک سی دھار جو ابھی تک اس کے سر سے نکل رہی تھی میرے ہاتھ پر آ پڑی۔

(۸)

دوسرے دن رفیق کی گمشدگی کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ دادا نے اس کی بہت تلاش کرائی۔ مگر بے سود۔ آخر کار وہ سکینہ کو اپنے گھر لے آئے۔ اور اس کا مکان مقفل کر دیا گیا۔ وہ رفیق کے راز سے بالکل بے خبر تھی۔ کیونکہ رفیق کی آنکھوں کے جادو کی وجہ سے راتوں کو اکثر وہ بے ہوش سوئی رہتی تھی۔ اس واقعے کو تھوڑے ہی دن گذرے تھے

کہ رات کے وقت سکینہ کے مکان میں خدا جانے کس طرح آگ لگ گئی شعلے آسمان کی خبر لانے لگے۔ ہر چند آگ بجھانے کی کوشش کی گئی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ تمام مکان معہ باغ اور بار سنگار کے جنگل کے جل کر بھسم ہو گیا۔

سکینہ کو اپنی بربادی کا بہت صدمہ تھا۔ اور اسی غم سے اس کی صحت خراب ہوتی گئی۔ جب انگور کے حکیموں سے فائدہ نہ ہوا۔ تو مجھے جموں کسی قابل ڈاکٹر کو لانے کے لئے جانا پڑا۔

قمری مہینے کی ستائیسویں رات تھی۔ آج رفیق کے انجام کو پورا ایک مہینہ ہو چکا تھا۔ میں جموں میں دادا کے ایک دوست کے مکان پر سو رہا۔ صبح مجھے ڈاکٹر کو ساتھ لے کر گھر جانا تھا۔ یکایک میرے ہاتھ سے ایک قسم کی خوشبو آنے لگی۔ جس سے میرا جی متلانے لگا۔ میں نے اپنی طبیعت کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر لاحاصل۔ فوراً ہی بڑے زور سے استفراغ ہوا۔ میں چارپائی کی پٹی پر جھکا ہوا قے کر رہا تھا۔ میرا ہاتھ ذرا نیچا ہوا۔ تو مجھے سخت ٹیس محسوس ہوئی۔ میں تڑپ کر رہ گیا۔ میں نے دیکھا تو ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا۔ آخر میرا بند شدت درد سے ٹوٹنے لگا میں بے چین ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اچانک میری نظر کمرے کے فرش پر پڑی تو وہاں کئی سانپ رینگ رہے تھے۔ میں گھبرا گیا ایک دردناک چیخ

میرے منہ سے نکلی اور میں بیہوش ہو گیا۔

دو تین دن تک میرا علاج ہوتا رہا۔ جب کچھ آرام ہوا۔ تو میں ڈاکٹر کو لے کر اپنے گھر آ گیا۔ دادا نے دیر کی وجہ پوچھی تو میں نے کسی بہانے سے ٹال دیا۔ ایک ماہ بعد جب پھر قمری مہینے کی ستائیسویں رات آئی تو میرے ہاتھ سے خوشبو آنے لگی۔ جس سے میں مدہوش ہو گیا۔ دوسرے دن معلوم ہوا۔ کہ مجھے پھر سانپ نے ڈس لیا ہے۔ دادا نے جب یہ سنا کہ دو مہینے سے متواتر مجھ پر یہ حادثہ گذر رہا ہے تو وہ بہت متفکر ہوئے۔ کئی ڈاکٹروں اور حکیموں سے میرا علاج کرایا گیا۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔

اب ہر مہینے کی ستائیسویں رات کو بدستور مجھے سانپ نے کاٹنا شروع کیا۔ سکینہ کو ایک تو اپنا گھر بار تباہ ہو جانے کا قلق تھا۔ دوسرے میری انوکھی بیماری کا رنج، روز بروز اس کی حالت خراب ہوتی گئی۔ آخر کار چھ ماہ کے اندر اندر بے چاری ناشاد و نامراد اس دنیا سے اٹھ گئی۔

میری بیماری اور سکینہ کی بے وقت موت نے دادا کی کمر توڑ دی اور وہ اسی غم میں دو مہینے کے بعد چل بسے۔ اب اتنے بڑے گھر میں صرف میں تھا یا میری والدہ۔ گو میرا دل دنیا سے اچاٹ ہو چکا

تھا۔ مگر والدہ کا خیال کرتے ہوئے میں نے زمینداری کا کام سنبھال لیا۔

ایک سال تو فصل بہت اچھی رہی۔ لیکن دوسرے سال کھیت میں ایک خاص قسم کی ٹڈی پڑ گئی۔ جس نے فصل کو دیمک کی طرح چاٹ لیا مجھے اس سال بڑا نقصان رہا۔ اور بڑی تگ و دو سے اس بلا کو کھیتوں سے دور کیا گیا۔ دوسرے سال جب فصل پک کر تیار ہوئی۔ تو پھر اسی مصیبت کا سامنا ہوا۔ اس سال مجھے اتنا نقصان ہوا کہ میری زمینداری کا کاروبار بگڑ گیا۔ اور میں مقروض ہو گیا۔

اب ہر سال میرے کھیتوں پر ایسی ہی آفتیں نازل ہونے لگیں۔ رفتہ رفتہ میری حالت یہ ہو گئی۔ کہ میں دیوالے کی درخواست پر مجبور ہو گیا۔ اور والدہ کو ساتھ لے کر جموں چلا آیا۔ جہاں میں اسکول ماسٹری کرنے لگا۔ لیکن لوگ میری اس عجیب و غریب بیماری کا حال سُن کر ہچکچانے لگے۔ کوئی میرے ساتھ چھونا اور بات کرنا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ آخر کار سب بچوں کے والدین نے مل کر درخواست کی ایسا خوفناک شخص استاد ہونے کے قابل نہیں۔ چنانچہ میری ملازمت چھوٹ گئی اور میں محنت و مشقت کر کے اپنا اور اپنی والدہ کا پیٹ پالتا رہا۔

دو سال ہوئے میری والدہ فوت ہو گئی ہے۔ اور میں نے اپنے وطن کو چھوڑ دیا ہے۔ خوش قسمتی سے آپ کے ہاں ملازمت مل گئی ہے

اَب ہر قمری مہینے کی آخری راتوں کو بظاہر رخصت پہ چلا جاتا ہوں لیکن درحقیقت کہیں جاتا نہیں۔ بلکہ کمرے کو باہر سے مقفّل کر کے کھڑکی کے ذریعے اندر داخل ہو جاتا ہوں۔ اور تین چار دن تک یعنی جب تک میری حالت درست نہیں ہوتی کمرے میں پڑا رہتا ہوں۔

گلنار

گیتی آرا گلنار سے جس قدر محبت کرتی تھی۔ شجاع اسی قدر اس سے نفرت کرتا تھا جب کبھی وہ اُسے دیکھ پاتا۔ نہایت غضبناک ہو کر کہتا "گیتی آرا! اس ڈائن کو یہاں سے دور کر دے۔ ورنہ میں اس کو گولی مار دوں گا۔"

درحقیقت وہ تھی بھی ڈائن۔ اسے یہ کہنا بالکل موزوں تھا۔ اس کا رنگ سیاہ اور شکل مکروہ تھی۔ مگر اپنی اپنی طبیعت ہے۔ گیتی آرا

اس پر جان و دل سے فدا تھی۔ جب تک گلنار نہ کھا لیتی۔ گیتی آرا کے حلق سے نوالہ نہ اُترتا تھا۔

گلنار بڑی سمجھدار تھی۔ اس کی محبت کو محسوس کرتی اور اس کا دل خوش کرنے کو طرح طرح کی حرکتیں کیا کرتی۔ وہ نہایت صفائی پسند تھی بڑے سلیقے سے کھانا کھاتی۔ اور ایک گدیلے والی کرسی جو گیتی آرا نے خاص اسی کی خاطر بنائی تھی۔ بیٹھی رہتی۔

جب شجاع کے پاؤں کی آہٹ سنتی۔ تو جھٹ اُچک کر گیتی آرا کے ڈریسنگ روم میں گھس جاتی۔ اور جب تک شجاع گھر میں رہتا۔ اونچا سانس تک نہ لیتی۔ گیتی آرا اس کی اس عقلمندی کی بہت معترف تھی۔ اور اکثر بڑے فخر سے کہا کرتی۔ کہ جتنی عقلمند میری گلنار ہے اتنا عقلمند کوئی انسان بھی نہیں۔

(۲)

شجاع اور گیتی آرا کی آپس میں بڑی محبت تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ ان کی شادی کو پانچ سال گذر گئے ہیں مگر نخل امید بارآور نہ ہوا تھا۔ وہ ایک کامیاب بیرسٹر اور والدین کا اکلوتا فرزند تھا۔ چنانچہ اس حالت میں گیتی آرا کا بانجھ ہونا سخت خطرناک تھا۔

شجاع کے والدین اس کو باولاد دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ اس کی والدہ کی عین آرزو تھی۔ کہ اس کا سونا گھر ایک معصوم اور شوخ ہستی کی برکت سے بارونق ہو۔ کوئی اسے توتلی زبان سے دادی اماں کہے۔ اسے دلفریب شرارتوں سے ستائے اور معصومانہ اداؤں سے مچل کر اس کا دل لبھائے۔ گیتی آرا بھی اس کمی کو محسوس کرتی تھی۔ مگر یہ خدا کی دین ہے۔ کسی کے بس کی بات نہیں۔

جوں جوں دن گذرتے جاتے۔ گیتی آرا کے تفکرات میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ کیونکہ اس کا مستقبل تاریک تھا۔ اپنے حسرتناک انجام کا نقشہ اُسے آنکھوں کے سامنے دکھائی دیتا تھا۔ اور وہ اکثر اپنی پائمالی محبت کے خیال سے تھرا اُٹھتی تھی۔

جب تک شجاع گھر میں رہتا۔ گیتی آرا کا دل بہلا رہتا۔ مگر جونہی وہ عدالت کو جاتا وہ افسردہ ہو جاتی۔ کیونکہ گھر میں کوئی اس سے کھل کر بات چیت نہ کرتا تھا۔ اس لئے اس نے اپنا غم غلط کرنے کو گلنار پال رکھی تھی۔ جو اس کی محبوب بلی تھی۔ وہ اکثر تنہائی میں اس سے باتیں کیا کرتی جس کے جواب میں گلنار اس کو ایسی نگاہوں سے دیکھتی جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ اس کی باتیں سمجھتی اور دکھ درد میں اس کی شریک ہے۔

شجاع کو والدین بارہا دوسری شادی کے لئے کہہ چکے تھے۔ مگر وہ

انکار کرتا رہا۔ آخر جب ان کا اصرار حد سے بڑھ گیا۔ تو مجبوراً اسے رضامند ہونا پڑا۔

(۳)

شجاع کی دوسری شادی کو بھی مدّت گذر گئی۔ مگر بچے کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ اس کی والدہ ہنوز زندہ تھی۔ وہ چاہتی تھی۔ کہ ایک دفعہ اور شجاع کی شادی کر کے قسمت آزمائی کرے۔ لیکن اب اس کا نئی بہو سے سابقہ تھا۔ جس نے شجاع کو اس طرح قابو کیا تھا۔ کہ اسے دم مارنے کی جرأت نہ تھی۔ گیتی آرا کو وہ بالکل بھول چکا تھا۔

شہزادی اپنی چالاکیوں سے اس کو موقع ہی نہ دیتی تھی۔ کہ وہ کسی سے ملنے کے لئے وقت نکال سکے۔ وہ ہر وقت اس کی ناز برداریوں میں مصروف رہتا۔ شجاع کے اس طرزِ عمل سے گیتی آرا کو سخت قلق ہوتا تھا۔ مگر وہ راضی برضا تھی۔

شہزادی شکل وصورت میں تو گیتی آرا کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ مگر ناز نخرے میں طاق تھی۔ مرد کی تسخیر کا گر جانتی تھی۔ وہ سخت مزاج۔ کمینہ خصلت اور تند خو عورت تھی۔ اس کا باپ ایک اعلیٰ خاندان کا رکن تھا۔ لیکن ماں ایک بازاری عورت تھی۔ اور ماں کی تربیت کا اثر اس کے رگ و ریشہ میں سرایت

کیئے ہوئے تھا۔ وہ گیتی آرا کے خون کی پیاسی تھی۔ اس نے محل سرا کی طرف کھلنے والے دروازے عرصہ سے بند کرا دیئے تھے۔ تاکہ شجاع کی نظر کہیں گیتی آرا پر نہ پڑ جائے۔ اس انقلاب نے گیتی آرا پر دنیا کا عیش و آرام حرام کر دیا۔ اس کی اس بے کیف زندگی میں واحد غم گسار اس کی پیاری بلی گلنار تھی۔

(۴)

جنوری کے آخری دن تھے۔ شجاع خواب راحت سے بیدار ہوا تو اس کی نظر میز پر رکھے ہوئے چنبیلی کے ایک خوبصورت ہار پر پڑی۔ جس کے قریب ہی ایک رقعہ پڑا تھا۔ رقعہ دیکھ کر اسے یاد آگیا کہ آج اس کی پہلی شادی کی سالگرہ ہے۔ اس نے ہار کو اٹھا کر آنکھوں سے لگا لیا۔ بھولی ہوئی گیتی آرا کی یاد تازہ ہوگئی۔ گذشتہ ایام کی پُر محبت زندگی کا نقشہ سینما کی متحرک تصاویر کی طرح آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ اسے اپنے ظالمانہ سلوک سے جو اس نے چھ سال سے اس کے ساتھ روا رکھا تھا سخت ندامت ہوئی وہ آہ سرد بھر کر کہنے لگا۔ "آہ گیتی آرا کیسی عقلمند ہے۔ زرد چنبیلی کا ہار بھیج کر اس نے مجھے اس بے اعتنائی پر ملامت کی ہے۔ کیا اس سے میری محبت انہی پھولوں کی طرح زرد ہو چکی ہے۔"

وہ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح ہار کو ہاتھ میں لے کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ بہت عرصہ تک انہی خیالات میں محو رہا۔ اور ابھی خدا جانے کب تک اسی حالت میں رہتا۔ مگر شہزادی کی کرخت آواز سے چونک اٹھا۔

شہزادی۔ کیا اس بیہودہ عورت نے اس دفعہ پھر زرد پھولوں کا تحفہ بھیجا ہے۔ یہ پھول تو تابوت پر ڈالے جاتے ہیں۔ کون نمک حرام یہ ہار یہاں لایا ہے؟

یہ کہتے ہوئے اس نے یہ ہار شجاع کے ہاتھ سے لے کر پھینک دیا اس کے بعد گیتی آرا کو کوستی اور نوکروں کو برا بھلا کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی شجاع نے منہ سے تو کچھ نہ کہا۔ مگر اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ وہ سوچنے لگا۔ کیا مظلوم گیتی آرا کا تحفہ محبت ہر سال اسی طرح پائے استحقار سے ٹھکرا دیا جائے گا۔

وہ تمام دن مغموم رہا۔ شام کے قریب جب وہ باہر سیر کو گیا۔ تو بغیر کسی ارادے کے چلتے ہوئے باہر کے راستہ سے محل سرا میں داخل ہو کر سیدھا گیتی آرا کے کمرے میں جا نکلا۔ گیتی آرا دریچہ کے قریب کرسی پر بیٹھی بحرِ فکر میں غوطہ زن تھی۔ وہ خاکی رنگ کے کپڑے پہنے تھی۔ اس کے عنبر افشاں سیاہ بال اُلجھے ہوئے کندھوں پر پریشان تھے۔ سورج کی آخری کرن اس کے زردی مائل دلفریب چہرہ کو چار چاند لگا رہی تھی۔ گلشن آرا بھی

اپنی کرسی پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔

وہ کئی منٹ تک دروازے میں کھڑا اس کو دیکھتا رہا۔ گیتی آرا اپنے خیالات کی رو میں بہہ رہی تھی۔ شجاع کی موجودگی کا اس کو مطلق احساس نہ ہوا۔ مگر گلنار نے اسے نیم وا آنکھوں سے دیکھتے ہوئے فوراً ہی چھلانگ لگائی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

گلنار کی اس حرکت پر وہ ایک دم چونک پڑی اور سامنے شجاع کو کھڑا دیکھ کر بے اختیار ایک چیخ اس کے منہ سے نکلی اور لڑکھڑاتے ہوئے اس کے استقبال کو بڑھی۔ لیکن شجاع وہیں کھڑا رہا۔ ندامت سے اس کے پاؤں بھاری ہو رہے تھے۔

(۵)

اس واقعہ کے بعد شجاع شہزادی سے چوری چھپے اکثر گیتی آرا کے پاس آتا جاتا رہا۔ جب اس ملاپ کو ایک سال کے قریب ہو گیا۔ تو یکایک گیتی آرا سخت بیمار ہو گئی۔ کھانا پینا چھوٹ گیا۔ اور سوکھ کر کانٹا ہو گئی پہلے تو معمولی بات سمجھ کر اس نے کسی سے بیماری کا ذکر نہ کیا۔ لیکن آخر جب تکلیف زیادہ بڑھ گئی تو ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ جو معائنہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ مسز شجاع حاملہ ہیں۔

یہ نوید جانفزا سن کر فرطِ طرب سے شجاع کی باچھیں کھل گئیں۔ بڑی بیگم نے منہ مانگی مراد پائی۔ شہزادی نے جب یہ خبر سنی تو وہ سناٹے میں آگئی۔ مگر کیا کر سکتی تھی۔ گتھی سلجھنے والی نہ تھی۔ جل بھن کر رہ گئی۔ آخر اس نے اس غداری کا بدلہ لینے کی ٹھان لی۔

شجاع کو خوف تھا کہ نہ جانے اب شہزادی کیا آفت برپا کرے گی۔ مگر برخلاف اس کے شہزادی نے اُسے مبارک باد دی۔ اس خبر پر نہایت خوشی کا اظہار کیا۔ اور رفتہ رفتہ گیتی آرا سے بھی راہ و رسم بڑھا کر اپنی ریاکارانہ محبت میں اُسے ایسا اسیر کر لیا۔ کہ وہ اس کا دم بھرنے لگی۔ گیتی آرا کا کمرہ بازار کے سرے پر واقع تھا جس کے نیچے ہر وقت دوکانداروں کی کرخت آوازیں۔ موٹریں اور ٹانگوں کا شور و غل بپا رہتا۔ شہزادی اب اکثر اس کے کمرے میں آتی اور دریچے میں بیٹھ کر پہروں اس پُر رونق بازار کی سیر دیکھا کرتی۔

شام کا وقت تھا۔ گیتی آرا اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹی تھی۔ شہزادی مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کی ایک پلیٹ تھی۔

شہزادی۔ بہن آج طبیعت کیسی ہے۔

گیتی آرا۔ بدستور خراب ہے۔

شہزادی۔ کچھ کھایا پیا بھی ہے۔

گیتی آرا۔ بہن کھانے کو جی نہیں چاہتا۔

شہزادی۔ اس طرح فاقہ کرنے سے تو بہت کمزوری ہو جائے گی۔ لو یہ تھوڑی سی مٹھائی کھا لو۔ امی جان نے نیاز کی بھیجی تھی۔ یہ تمہارا حصّہ ہے۔

گیتی آرا کی طبیعت آج بہت بد مزہ تھی۔ اسے متلی ہو رہی تھی مگر شہزادی کے خوش کرنے کو اس نے پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے لی اور رس گُلا اٹھا کر کھانے لگی۔

شہزادی مسکراتی ہوئی دریچہ میں بیٹھ کر بازار کا نظارہ دیکھنے لگی۔

گیتی آرا نے رس گُلا اٹھایا۔ مگر کھانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ اس نے شہزادی کی آنکھ بچا کر سب مٹھائی گلنار کی پلیٹ میں ڈال دی۔ اور خود یونہی منہ ہلاتی رہی اور جب وہ مٹھائی ختم کر چکی۔ تو گیتی آرا نے شہزادی کو دکھانے کے لئے تولیہ سے منہ ہاتھ پونچھ کر خالی پلیٹ میز پر رکھ دی۔

(۶)

رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ یکایک گلنار کرب و اضطراب سے لوٹنے لگی۔ گیتی آرا کی آنکھ کھل گئی۔ اسے بیدار دیکھ کر گلنار نہایت دردناک آواز سے کراہنے لگی۔ اس کی حالت متغیر تھی۔ پتلیاں پھر گئی تھیں۔ سانس رک رک کر آتا تھا۔ اور وہ کوئی دم کی مہمان معلوم ہوتی تھی۔

گیتی آرا کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ وہ انتہائی الم سے سر پکڑ

کو مبٹھ گئی اور بے اختیار اس کے آنسو جاری ہو گئے۔ اتنے میں کسی نے زور سے دستک دی۔ گیتی آرا سہم گئی۔ کہ اس وقت دستک کے کیا معنی آخر دل کڑا کر کے پوچھا کون ہے۔ "جلدی دروازہ کھولو" کسی نے کہا۔ آواز پہچان کر گیتی آرا نے فوراً دروازہ کھول دیا۔

شجاع بوکھلایا ہُوا اندر آیا اور کہنے لگا۔ اُف گیتی آرا غضب ہو گیا جلدی چلو۔ شہزادی قریب المرگ ہے۔ اس ناگہانی خبر سے گیتی آرا کے دل پر دھکا سا لگا۔ وہ کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔ اور تھر درویش بر جان درویش گلنار کو اسی حالت میں چھوڑ کر شجاع کے ساتھ چلدی۔

گیتی آرا کو دیکھ کر شہزادی باوجود انتہائی کرب کے بستر سے اُچھل پڑی "آہ تم ابھی زندہ ہو" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "کیوں کیا ہے" شجاع نے کانپ کر کہا۔

شہزادی (مایوسانہ نگاہوں سے دیکھ کر) میں نے پہلے اس کو مٹھائی میں سنکھیا ملا کر کھلایا۔ اور بعد میں خود کھایا۔ مگر تعجب ہے اس پر ابھی تک کچھ اثر نہ ہُوا۔

شہزادی کی زبان سے یہ لفظ سُنکر شجاع تھرّا اٹھا۔ مگر گیتی آرا کہنے لگی بہن جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ میں نے وہ مٹھائی خود نہیں کھائی تھی۔ بلکہ گلناد کو دے دی تھی۔ آہ وہ بے چاری مجھ پر صدقے ہو گئی۔ اب تک یقیناً

مر چکی ہو گی۔

شہزادی۔ (اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے) آہ تم زندہ رہو اور میں اس دنیا سے نامراد جا رہی ہوں۔ افسوس صد افسوس۔

اس کی آنکھیں بے نور ہو گئیں۔ ناک ٹیڑھی اور اعضاء بے حس و حرکت ہو گئے۔ وہ کئی منٹ تک بالکل خاموش رہی۔ یکایک اس نے اپنی سب قوتوں کو یکجا جمع کر کے پھر آنکھیں کھول دیں اور اپنی نظریں بحال کر کے کہنے لگی۔

شہزادی۔ گیتی آرا تم خوش ہو گی۔ کہ میں مر رہی ہوں۔ لیکن یاد رکھو میری روح تم سے ضرور انتقام لے گی۔

اتنا کہتے ہوئے اس کی گردن کا منکا ڈھلک گیا۔ اور روح تن سے جُدا ہو گئی۔

(۷)

شہزادی کی تجہیز و تکفین کے بعد جب گیتی آرا اپنے گھر گئی تو یہ دیکھ کر اس کے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ گلنار صحیح و سلامت اپنی کرسی پر بیٹھی ہوئی ہے۔

اس حادثہ کے دو مہینے بعد خدا نے گیتی آرا کو چاند سا بیٹا عطا کیا۔ مگر

افسوس یہ خوشی ان لوگوں کو زیادہ دیر تک دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ بچہ پندرہ دن زندہ رہ کر گھر والوں کو داغِ مفارقت دے گیا۔

بچے کی موت سے گیتی آرا اور شجاع نہایت دل برداشتہ ہو گئے۔ بڑی بیگم کو تو ایسا صدمہ ہُوا۔ کہ وہ جانبر نہ ہو سکی۔ ان کے بعد گھر کی رہی سہی رونق بھی کافور ہو گئی۔ شجاع تو پھر بھی باہر جا کر دو گھڑی دل بہلا لیتا۔ مگر گیتی آرا تصویرِ یاس بنی ہوئی ہر وقت کڑھتی رہتی۔ درو دیوار کاٹنے کو دوڑتے تھے اب اسے کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ گلنار نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

جب سے گلنار اس خوفناک موت کے منہ سے بچی تھی۔ اس دن سے اس کی عادتیں بالکل بدل گئی تھیں۔ وہ نہایت غصیلی اور خونخوار ہو گئی تھی۔ اب وہ اکثر اوقات گیتی آرا پر غرّاتی اور شجاع کو دیکھ کر بھی سامنے ڈٹی رہتی۔ اور اکثر اوقات ایسی خوفناک آواز نکال کر روتی۔ کہ سننے والوں کے دل دہل جاتے۔

گیتی آرا نے اُس کے گلے میں پٹہ ڈال دیا تھا۔ یہ تمام دن برآمدے میں زنجیر سے بندھی رہتی۔ اور رات کو کھول دی جاتی تھی۔

ڈیڑھ سال بعد پھر گیتی آرا کے لڑکی پیدا ہوئی۔ مگر وہ بھی پندرہ دن تک زندہ رہ کر بغیر کسی بیماری کے اچانک مر گئی۔ اس بچی کی موت سے

شجاع کو یقین ہو گیا۔ کہ یہ مکان آسیب زدہ ہے وہ اکثر اوقات رات کو نہایت ڈراؤنے خواب دیکھتا تھا۔ چنانچہ ان توہمات کے زیر اثر اُس نے وہ گھر چھوڑ دیا۔ اور باہر کوٹھی میں سکونت اختیار کر لی۔

یہاں آکر بھی ان خوفناک خوابوں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ اکثر دیکھتا کہ گلنار گیتی آرا کے سرہانے بیٹھی ہنس رہی ہے اور بعض دفعہ اسے محسوس ہوتا کہ گلنار کا قد بڑھتے بڑھتے گدھے جتنا ہو گیا ہے۔ اس کا خیال تھا۔ کہ یہ واقعات عالم بیداری کے ہیں۔ مگر گیتی آرا اُس کے اس خیال کو تمسخر میں اڑا دیا کرتی تھی۔

اُسی سال گیتی آرا کو پھر امیدواری ہوئی۔ شجاع کے باپ کے ایک دوست شیخ نیاز احمد نے جو ایک عالم باعمل تھے۔ استخارہ کر کے شجاع کو بتایا۔ کہ گیتی آرا کے بچوں پر کسی بدروح کا سایہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک تعویذ دیا کہ جب بچّہ پیدا ہو تو اس کے گلے میں ڈال دیا جائے۔

اتفاق کی بات سمجھو یا خدا کی قدرت۔ گیتی آرا کا تیسرا بچہ اصغر زندگی والا پیدا ہوا۔ شجاع اور گیتی آرا کے رنج واندوہ مسرت میں تبدیل ہو گئے۔ اور وہ اپنے آپ کو دنیا میں سب سے زیادہ خوش قسمت تصوّر کرنے لگے۔

بچہ نہایت تندرست اور موٹا تازہ تھا۔ والدین کا اعتقاد تھا۔ کہ بچّہ نے تعویذ کی برکت سے ہی زندگی پائی ہے۔ چنانچہ وہ تعویذ کسی وقت

بھی اُس کے گلے سے علیحدہ نہ کیا جاتا تھا۔

(۸)

اصغر کی پہلی سالگرہ تھی۔ شام کا وقت تھا۔ گیتی آرا کا کمرہ دلہن کی طرح سجا ہُوا تھا۔ گلدستوں کی بو باس سے تمام کوٹھی مہک رہی تھی۔ برقی قمقموں کی تیز روشنی شیشوں کے سامان پر پڑ کر نہایت دلفریب سماں پیش کر رہی تھی۔ جا بجا دروازوں پر زر و تار سہرے لٹک رہے تھے۔ جو ایسی تقریب پر اکثر باندھے جاتے ہیں۔ در و دیوار سے شادمانی ٹپک رہی تھی۔ شجاع میز کے قریب کھڑا نہایت خوشی سے ان تحائف کو دیکھ رہا تھا۔ جو میز پر قرینے سے رکھے تھے۔ اور کمرے کی زینت کو دوبالا کر رہے تھے۔ یہ وہ تحائف تھے۔ جو شجاع اور گیتی آرا کے عزیزوں نے اصغر کو سالگرہ پر دیئے تھے۔

مہمان عورتیں رخصت ہو گئیں۔ گیتی آرا اصغر کو گود میں لئے اندر داخل ہوئی۔ بچے کو دیکھ کر شجاع کا چہرہ پھول کی طرح کھل گیا۔ اس نے بچے کو ماں کی گود سے لے لیا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر اُس سے کھیلنے لگا۔

یکایک اس کی نظر بچے کے گلے پر پڑی۔ وہ گھبرا کر کہنے لگا۔

"گیتی آرا اس کا تعویذ کہاں ہے"؟

یہ سنتے ہی گیتی آرا سٹ پٹاتی ہوئی غسل خانے کی طرف بھاگی۔ اس نے نہلاتے وقت اسے اُتار کر شیلف پر رکھا تھا۔ مگر اب اس کا نام نشان تک نہ تھا۔ تعویذ کی گم شدگی سے ان کے دل بُجھ گئے۔ اور رنگ فق ہو گیا۔ تمام مسرتیں یک دم کافور ہو گئیں۔ دونوں عالم یاس میں بچے کو گود میں لے کر پلنگ پر بیٹھ گئے۔

رات طویل اور خوفناک تھی۔ بارہ بجے کے بعد جھکڑ چلنا شروع ہو گیا۔ بارش کے ساتھ اولے بھی پڑنے لگے۔ رعد کی گرج اور برق کی چشمک زنی قیامت برپا کرنے لگی۔ ہوا نے وہ زور باندھا کہ الاماں۔

کمرے میں اداسی چھائی تھی۔ پچھواڑے کی طرف برج میں گلنار بیٹھی نہایت پُر درد آواز میں "میاؤں میاؤں" کر رہی تھی۔ اس کی ہولناک آواز شب تار کی نحوست میں دوچند اضافہ کر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صدہا بد روحیں بین کر رہی ہیں۔

باہر توشہ خانہ کی طرف سے برتنوں کی جھنکار سن کر گیتی آرا کے کان کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر کھٹکا ہوا۔ پھر پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ وہ کانپنے لگی۔ شجاع نے اسے تسلی دینے کی غرض سے پستول بھر کر پاس رکھ لیا۔

اتنے میں روشندان سے کوئی چیز دھماکے کے ساتھ گری۔ گیتی آرا خوف سے اُچھل پڑی۔ شجاع نے کہا: "اوہو یہ تو گلنار ہے۔" گلنار آتے

ہی ڈریسنگ روم میں گھس گئی۔ شجاع نے اٹھ کر ڈریسنگ روم کے دروازے میں چابی گھما دی۔ تاکہ گلنار باہر نہ نکل سکے۔

رات چوتھائی کے قریب گزر چکی تھی۔ شجاع اور گیتی آرا کی آنکھ لگ گئی۔ یکایک گیتی آرا نے خواب میں دیکھا۔ کہ شہزادی اس کے ساتھ ہاتھا پائی کر کے بچہ چھیننا چاہتی ہے۔ اور دہشت سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اتفاقاً اس کی نظر ڈریسنگ روم کے دروازے پر جا پڑی۔ دروازہ آہستہ آہستہ کھلا۔ ایک عورت اندر سے نمودار ہوئی۔ گیتی آرا چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی شجاع جاگ اٹھا۔ اس نے دیکھا۔ کہ شہزادی پلنگ کے قریب بچے پر جھکی ہوئی ہے۔ گھبرا کر اس نے یکایک پستول داغ دیا۔ ایک خوفناک چیخ کے ساتھ دھم سے کوئی چیز زمین پر گر کر کراہنے لگی۔

یک لخت بجلی فیوز ہو گئی۔ کمرہ دھوئیں سے بھر گیا۔ شجاع حواس باختہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ ادھر اصغر نے گلا پھاڑ پھاڑ کر رونا شروع کر دیا۔ اس کے رونے سے شجاع کی کچھ ڈھارس بندی۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

مطلع صاف ہو چکا تھا۔ آخری مہینہ کے چاند کی پھیکی روشنی کمرے میں پڑنے لگی۔ شجاع نے بچے کو اٹھا لیا۔ اتنے میں گیتی آرا بھی تازہ ہوا کے جھونکے سے ہوش میں آ گئی۔ اور "میرا بچہ، میرا بچہ" کہہ کر ادھر ادھر

دیکھنے لگی۔

"تمہارا بچّہ محفوظ ہے۔ شجاع نے کہا۔ اور گیتی آرا کا ہاتھ پکڑ کر برآمدے میں لے آیا۔ ادھر پستول کا دھماکا سن کر ملازم بھی آ چکے تھے۔ شجاع نے انہیں لیمپ جلانے کا حکم دیا۔ لیمپ روشن ہونے پر دونوں اندر اُگئے۔ یہ دیکھ کر اُن کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کہ بجائے شہزادی کے فرش پر گلنار کی لاش پڑی تھی۔

زیتون

کائنات کا سارا نظام قسمت کے ماتحت چل رہا ہے۔ زندگی اور قسمت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ قسمت ہی انسانی زندگی کو بناتی ہے اور بگاڑتی ہے۔ جو لوگ قسمت کے قائل نہیں وہ میری پر اسرار زندگی کا مطالعہ کریں۔ اپنی گذشتہ زندگی پر غور کر کے میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ دنیا ایک تماشہ گاہ ہے۔ جس میں زندگی کے پردۂ سیمیں پر قسمت کی مشین سے طرح طرح کے کھیل دکھائے جاتے ہیں۔

میں تعلیم یافتہ ہوں۔ دولت مند ہوں۔ والدین کی اکلوتی بیٹی۔ اور شوہر کی محبوب بیوی۔ آج سے چند سال پہلے میں بالکل کس مپرسی کی حالت میں تھی۔ کوئی باور نہ کر سکتا تھا، کہ یہ لڑکی اس عروج کو پہنچے گی۔ مگر قسمت نے ذرے کو آفتاب بنا دیا۔

میری ماں ایرانی النسل تھی۔ میں شیراز میں پیدا ہوئی۔ شیراز میں داستان گوئی کا پیشہ عام ہے چنانچہ میری ماں کا ذریعہ معاش بھی یہی تھا وہ ایک مشہور رئیس خواجہ حسن قاچاری کی حرم سرا میں ملازم تھی۔ انہی کے دستر خوان کی ریزہ چینیوں پر ہمارا گذارہ تھا۔ میں اس وقت آٹھ برس کی تھی۔ اور ہر طرف بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتی پھرتی۔ بیگمات کے چھوٹے چھوٹے کام بڑی خوشی سے کرتی۔ ہر ایک کی خوشی اور رضامندی کو مدنظر رکھتی۔ اس وجہ سے بیگمات مجھ پر بہت مہربان رہتیں۔ اور اکثر چھوٹی چھوٹی چیزیں بطور انعام دیا کرتیں۔ دوسری خادمائیں مجھ سے حسد کرتیں۔ مجھے باتونی خالہ مکار لومڑی اور میموں ٹھگنی وغیرہ کے قابل نفرت ناموں سے مخاطب کرتیں لیکن میری ماں بڑی موقع شناس تھی۔ مطلق ملال کا اظہار نہ کرتی۔ بلکہ ہنسی ٹھٹھے میں بات اڑا دیتی تھی۔

(۲)

مجھے خوب یاد ہے۔ موسم بہار شروع تھا۔ جشن نوروز منایا جا رہا تھا۔ آقا

کا دلکشا باغ اِندر کا اکھاڑہ بن رہا تھا۔ قناتیں لگی ہوئی تھیں۔ جابجا جھولے
پڑے تھے۔ بیگمات خوش رنگ لباسوں میں ملبوس پینگیں بڑھاتی ہوئی
ایسی دکھائی دیتی تھیں جیسے خوبصورت تتلیاں ہوا میں اڑ رہی ہیں۔ تالاب
کے مصفا پانی میں رنگین مچھلیوں کا تیرنا قوسِ قزح کی کیفیت پیدا کر رہا تھا
درختوں کی ہری ہری کونپلیں پھوٹی ہوئی تھیں۔ نو شگفتہ غنچے جوشِ مستی
میں لہرا رہے تھے۔ اور عطر بیز ہوائیں چل رہی تھیں۔

میں آسمانی رنگ کا فراک پہنے ایک درخت کے پیچھے کھڑی دنیائے
فانی کی گوناگوں دلفریبیوں کو حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ میری
ماں نے پیچھے سے پکارا " یاسمین " میں دوڑ کر اپنی ماں سے لپٹ گئی۔ وہ
کہنے لگی۔ آؤ تمہیں گود میں اٹھا لوں۔ صبح سے پھر رہی ہو۔ تھک گئی ہوگی۔

میں۔ نہیں میں بالکل نہیں تھکی۔ مجھے تو ابھی باہر کی سیر بھی کرنی ہے

ماں۔ اچھا چلو پہلے تمہیں باہر کی سیر کرا لاؤں۔

میں خوشی خوشی اپنی ماں کے ساتھ ہولی۔ باہر کا سماں بے حد دلفریب
تھا۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی۔ سر سبز کھیت ہوا میں لہلہاتے نظر آتے
تھے۔ آبشاروں کا سیمگوں پانی اپنی سُریلی آواز میں پُر کیف گیت گاتا
ہوا مستانہ وار چل رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت اور چمکیلے سنگریزوں
پر سورج کی کرنیں کہکشاں کا نظارہ پیش کرتی تھیں۔ جگمگاہٹ سے تمام

دادی بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ پگڈنڈی پر چلتی ہوئی دور نکل گئیں۔ ہم واپس ہونے کو تھیں کہ سامنے کی کٹیا سے ایک بڑھیا نمودار ہوئی۔ بڑھیا کا چہرہ جھری دار اور بال بگلے کے پر کی طرح سفید تھے۔ اس کی گول گول چمکیلی آنکھیں اپنے حلقے میں نہایت تیزی سے حرکت کرتی تھیں۔ میں سہم کر اپنی ماں سے چمٹ گئی۔ وہ ہمارے قریب آکر میری ماں سے کہنے لگی۔

بڑھیا۔ تم کون ہو۔ اور کہاں سے آئی ہو؟

ماں۔ میں داستان گو ہوں۔ دلکشا باغ سے آئی ہوں۔ خواجہ کی حرم سرا میں ملازم ہوں۔

بڑھیا۔ یہ لڑکی انہیں کی ہے؟

ماں۔ نہیں یہ لڑکی میری ہے۔

بڑھیا۔ اس لڑکی کے لئے کہ اس طرح نہ پھرا کرو۔ یہ بہت خوش قسمت بچی ہے کسی کی نظر نہ لگ جائے۔

ماں۔ آہ ہمارے نصیب کہاں

بڑھیا۔ بیشک تمہارا ستارہ منحوس ہے۔ تمہیں اس کا عروج دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ (پھر میرا ہاتھ دیکھ کر) سنئے والدین۔ نیا نام۔ ہندوستان کی سرزمین۔ بچھڑوں کا ملاپ۔ شوہر عاشق زار۔ حسن برسے گا۔ اشرفیوں

ہیں کھیلے گی۔

میری ماں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ مگر اُس نے اپنی حالت پر قابو پالیا۔ اور ہم دونوں واپس آگئیں۔

(۳)

دوپہر کے وقت میری ماں مجھے تھوڑا بہت پڑھایا کرتی تھی۔ میں نے دو کتابیں ختم کر لی تھیں۔ اور اپنا نام لکھ لیا کرتی تھی۔ ایک دن میں نے اپنی ماں سے پوچھا۔

پیاری اماں میری کلائی پر میرے نام کے آگے کون سے لفظ کھدے ہوئے ہیں ؟

ماں ۔ یہ تمہارے باپ کا نام ہے " اظہر علی "

باپ کی شخصیت کے متعلق کبھی میرے دل میں خیال بھی نہ گذرا تھا ماں کے منہ سے یہ فقرہ سن کر میں نے تعجب سے کہا " میرے ابا "

ماں ۔ (ہنس کر) ہاں تمہارے ابا ۔ بے وقوف لڑکی۔ کیا تو بغیر باپ کے ہی پیدا ہو گئی تھی۔

میں ۔ اچھا پھر میرے ابا کہاں ہیں ؟ کیا وہ ....

ماں ۔ (آہ سرد بھر کر) بیٹی وہ ہمیں چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنے وطن کو چلے گئے ہیں۔

میں۔ وہ کہاں؟

ماں۔ ہندوستان۔

میں۔ امی وہی ہندوستان جس کا ذکر اس گٹھیا والی بڑھیا نے کیا تھا۔

بڑھیا کا نام سن کر میری ماں کا رنگ زرد ہو گیا۔ اور انتہائی یاس سے کہنے لگی "ہاں وہی ہندوستان"۔ میں نے اس کی یہ حالت دیکھ کر اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اور مچل کر کہا۔ اچھی اماں سچ بتاؤ اس بڑھیا کا نام سن کر تم رنجیدہ کیوں ہو گئی ہو۔ وہ تو بڑی اچھی باتیں کہتی تھی۔

ماں۔ بیشک۔ مگر ساتھ ہی میری موت کی پیشین گوئی بھی تو کی تھی۔

میں۔ کب۔ موت کا ذکر میں نے تو سنا نہیں۔

ماں۔ بھولی بچی۔ اس نے کہا تھا کہ مجھے تمہارا عروج دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ میں اس دنیا میں نہ ہونگی

میں یہ سن کر رونے لگی۔ میری ماں نے مجھے تسلی دی کہ نہ جانے یہ پیشین گوئی غلط ہی ہو۔ کیونکہ غیب کا علم صرف خدا کو ہے۔ خیر بات رفت گزشت ہو گئی۔ مگر مجھے ماں کی زندگی کے متعلق دھڑکا ضرور لگا رہا۔ بالآخر میرے خطرات صحیح ثابت ہوئے۔ یعنی اسی سال میری ماں نے ہیضہ

سے قضا کی۔ اور میں اس وسیع وعریض دنیا میں اکیلی رہ گئی۔

ماں کی موت کے بعد میری طبیعت بالکل بدل گئی۔ میری بشاشت اور شگفتہ دلی کافور ہوگئی۔ مزاج چڑچڑا ہوگیا۔ ہر وقت روتی رہتی۔ گو بیگمات مجھ پر ویسے ہی مہربان تھیں۔ مگر اب مجھے کوئی بھی اچھا نہ لگتا۔

سال ختم ہو چکا تھا۔ نوروز اپنی تمام تر دلآویزیوں اور خوش اقبالیوں کے ساتھ پھر آیا۔ ہر خاص وعام شاداں و فرحاں تھا۔ اور ہر کوئی بقدرِ حیثیت جشنِ نوروز منانے میں مصروف تھا۔ مگر امسال آقا کے ہاں خاص اہتمام تھا دلکشا باغ پر باغِ ارم کا دھوکا ہوتا تھا۔ سرو وسمن پر نور کا غازہ ملا ہوا تھا۔ سربفلک فواروں کا چھوٹنا۔ آبِ رواں کی مست خرامی باغ کے سبزہ زار پر خوشرنگ پھول اور صاف ستھری روشوں پہ پری وشوں کے جھرمٹ عجیب بہار دیتے تھے۔ نسیمِ بہار کے روح پرور جھونکے تروتازگی بخش رہے تھے۔ ہر طرف شادمانی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ لیکن مجھے ان دلفریبیوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ میں کونوں میں چھپ چھپ کر اپنی ماں کے لئے رو رہی تھی۔ آخر سب کی نظروں سے بچتی ہوئی فصیل پر چڑھ گئی۔ اور ایک برج کے بخارچے میں فرشِ زمین پہ سو گئی۔

خواب میں میں نے اپنی ماں کو دیکھا جو مجھ سے کہہ رہی تھی۔ "یاسمین کیوں رو رو کر ہلکان ہو رہی ہو۔ آج سے تمہاری سختیاں دور ہو جائیں گی

قدرت نے تمہارے لئے سامان پیدا کر دیا ہے۔"

"سبزہ دیکھو تو یہ لڑکی بالکل زیتون کی ہم شکل ہے۔"

میں یہ آواز سن کر چونک پڑی۔ دیکھا تو ایک دبلی پتلی حسین خاتون میرے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے پاس ایک بھدّے نقشوں کی موٹی تازی عورت کھڑی تھی۔ بیگم نے اسی سے مخاطب ہو کر یہ الفاظ کہے تھے۔ میں بھانپ گئی کہ یہ بیگم صاحبہ مہمان بیگمات میں سے ہیں۔ میں نے ان کو سلام کیا اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

بیگم ۔ بیٹی تم کون ہو ؟

میں۔ بیگم صاحبہ میں ایک یتیم لڑکی ہوں۔

بیگم ۔ تمہارا نام کیا ہے ؟

میں نے نام بتایا۔ پھر اپنی ماں کا ذکر کر کے رونے لگی۔ بیگم صاحبہ نہایت شفقت سے میرے سر پہ ہاتھ پھیرتی جاتی تھیں اور خود بھی روتی جاتی تھیں۔

دوسری عورت (جو ملازمہ تھی) بیگم صاحبہ۔ جب آپ خود ہی رو رہی ہیں تو اس معصوم بچی کا کیا حال ہو گا۔

بیگم ۔ سبزہ، کیا کروں اس بچی کا رونا مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ زیتون میرے سامنے بلک رہی ہے۔

اس پر بیگم صاحبہ میٹھی میٹھی باتوں سے مجھے بہلانے لگیں۔ ان کی آواز بڑی رسیلی اور الفاظ میں غضب کا جادو تھا۔ میں نے فوراً رونا دھونا موقوف کر دیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر نیچے اتر آئیں۔ اور بیگمات سے کہنے لگیں۔

عزیز بہنو! میری اکلوتی بیٹی زیتون ایک سال ہوا۔ مجھے اس پردیس میں داغ مفارقت دے گئی۔ آج میں نے یہ لڑکی دیکھی ہے۔ جو بالکل اس کی ہم شکل ہے۔

یہ کہہ کر بیگم صاحبہ نے مجھے اپنی گود میں بٹھا لیا۔ اور بہت دیر تک مجھے پیار کرتی رہیں۔ کھانا وغیرہ میں نے انہی کے ساتھ کھایا۔ شام کو بیگم صاحبہ ہماری بڑی خانم صاحبہ سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنے کے لئے بارہ دری میں چلی گئیں اور مجھے سبزہ کے پاس چھوڑ گئیں۔ مجھے سبزہ کی زبانی معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ واپسی کی اجازت لینے گئی ہیں۔ یہ سن کر میں سخت پریشان ہوئی۔ جدائی کے رنج سے میرا بُرا حال ہو رہا تھا۔ دل اندر ہی اندر بیٹھا جاتا تھا۔ وہ بارہ دری سے خانم صاحبہ کے ساتھ باہر آئیں تو میں نے مایوسانہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ مگر ان کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ مجھ سے کہنے لگیں۔

"عزیز بچی کیا تم میرے پاس رہنا پسند کرتی ہو؟"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں دوڑ کر دیوانہ وار ان سے لپٹ

گئی۔ وہ میرے گالوں پہ پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے سبزہ سے کہنے لگیں "اسے لے جاکر کار میں بٹھا دو۔"

سبزہ مجھے اٹھا کر باہر لے گئی۔ کار میں ایک گورے چٹے دوہرے بدن کے ہنس مکھ آدمی بیٹھے تھے۔ سبزہ سے کہنے لگے "ذرا اس بچی کو میرے پاس لاؤ۔ سبزہ مجھے ان کے پاس لے گئی، تو انہوں نے ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پہ ڈال کر کہا۔

"اوہو۔ یہ تو بالکل زیتون ہے۔"

اتنے میں بیگم صاحبہ بھی رخصت ہو کر آگئیں۔ یہ صاحب ان سے کہنے لگے، بیگم مبارک ہو، تمہیں اپنی زیتون واپس مل گئی۔

بڑھیا کی دو پیشین گوئیاں آج پوری ہو گئی تھیں۔

(۴)

میرے نئے والدین پنجاب کے رہنے والے تھے۔ ابا کا نام جعفر حسین تھا اور امی جان کا بلقیس بیگم۔ دونوں میاں بیوی نہایت ہی شریف النفس اور رحم دل واقع ہوئے تھے۔ ابا جان الیکٹرک انجینئر تھے۔ میرے ساتھ ان دونوں کو بے حد محبت تھی۔ مجھے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ امی جان کا تو یہ حال تھا کہ مجھے دم بھر کے لئے آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتیں۔

ان کی سب امیدیں اور مسرتیں مجھی سے وابستہ تھیں۔ میری خوراک اور پوشاک کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا۔ میرا رنگ وروغن اب خوب نکھر گیا تھا۔ امی جان مجھے ہر روز ایک گھنٹہ سینا پرونا اور خانہ داری کا کام سکھایا کرتی تھیں اور ابا جان شام کے وقت روزانہ دو گھنٹے مجھے لکھایا پڑھایا کرتے۔ میری زندگی نہایت مزے سے گزرنے لگی۔ جب میں بارہ سال کی ہوئی تو ابا جان کی ملازمت کا معاہدہ پورا ہو گیا اور میرے والدین وطن جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ پاس پورٹ بن کر آئے۔ اب بڑھیا کی تیسری پیشین گوئی بھی پوری ہونے کو تھی۔

اپریل کا ایک خوشگوار دن تھا۔ جب میں نے ساحلِ ہندوستان پر قدم رکھا۔ ہمارے چند عزیز واقارب ہمارے استقبال کو کراچی آئے ہوئے تھے۔ جن میں میرے نئے خالہ زاد بھائی حبیب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ اٹھارہ سال کے نوجوان تھے اور مردانہ حُسن کا اعلیٰ نمونہ تھے بی۔اے میں تعلیم پاتے تھے۔ مگر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان کا دماغی توازن درست نہیں۔ ان کے خیالات کچھ منتشر رہتے تھے۔ کیونکہ جب امی جان ان سے کوئی بات کرتیں تو وہ کسی گہری سوچ سے چونک کر اس بات کا جواب دیتے تھے۔ یہ میری نئی خالہ جان کے اکلوتے فرزند تھے۔

اِن سے مجھے پردہ کرایا گیا۔ جس کا سبب مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ کہ وہ میرے منگیتر ہیں۔ تیسرے دن ہم بذریعہ ریل اپنے گھر امرت سر پہنچے۔ میری نئی خالہ جان اور دیگر رشتہ دار بیبیاں مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ گو ان کی بود و باش اور طرزِ معاشرت میرے وطن سے بالکل جدا تھی۔ مگر میں بہت جلد ان میں ہل مل گئی۔ میرے والدین نے مجھے ایک گرلز سکول میں داخل کرا دیا۔ گھر میں ابا جان نے مجھے نہایت محنت اور تندہی سے تعلیم دی تھی۔ اس لئے مجھے ساتویں جماعت میں لے لیا گیا جہاں میں نے تین چار سال کے عرصے میں نہایت کامیابی کے ساتھ انٹرنس پاس کر لیا۔

(۵)

اب میں سولہ سالہ جوان لڑکی تھی۔ میرے حُسن کے گھر گھر چرچے تھے یوں تو ہر کوئی اپنے منہ میاں مٹھو بنتا جاتا ہے۔ مگر میرا حسن زبانی جمع خرچ پر موقوف نہ تھا۔ میں درحقیقت چندے آفتاب و چندے ماہتاب تھی۔ میرا بدن نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ میں کئی دفعہ آئینہ میں خود اپنی صورت دیکھ کر اپنے حسن سے متاثر ہو چکی تھی۔ اس غیر معمولی خوبصورتی نے مجھے قدرے مغرور کر دیا تھا۔

میری خالہ جان شادی کے لئے اصرار کر رہی تھیں۔ کیونکہ حبیب بھی ایم۔اے کر چکا تھا۔ میرے والدین کی بھی یہی خواہش تھی کہ جلد اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ اس لئے میرے انٹرنس پاس کرنے کے بعد فوراً شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ میرے اور حبیب کے والدین کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ تھا۔ ادھر میں بھی خوش تھی کہ حبیب جیسا یوسف ثانی شریکِ زندگی ہوگا۔

حبیب اکثر ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔ اور میں بدستور اس سے پردہ کرتی تھی۔ مگر جس دن سے شادی کی بات چیت چھڑ گئی اس دن سے حبیب نے ہمارے گھر آنا موقوف کر دیا۔ جوں جوں شادی کا دن نزدیک آتا جاتا۔ میری اماں جان کچھ مضطرب سی رہنے لگیں۔ دونوں بہنیں آپس میں سرگوشیاں کرتی رہتی تھیں۔ ان کے چہروں سے دلی الجھنوں کا صاف پتہ چلتا تھا۔ اب میری شادی میں آٹھ دن رہ گئے تھے۔ امی جان کسی ضروری کام کے لئے خالہ جان کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ سبزہ بھی اُن کے ساتھ تھی۔ دوسری ملازمہ خانساماں کو کھانے پکانے کی چیزیں دینے میں مصروف تھی۔ میں اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی ایک کدبلہ کاڑھ رہی تھی میرے پاس صرف ملازم لڑکا تھا۔ جو کھڑکی کے پاس کھڑا اسنڈگار میز صاف کر رہا تھا۔ وہ باہر کی طرف دیکھ کر مجھ سے کہنے لگا۔

لڑکا۔ چھوٹی بیگم صاحبہ! میاں حبیب صاحب بالاخانے پر تشریف لا رہے ہیں۔

میں۔ امی جان تو گھر نہیں ہیں۔ تم جلد جا کر ان کو بٹھاؤ۔ اور ان کے لئے چاء تیار کراؤ۔

لڑکا۔ مگر وہ تو یہیں آرہے ہیں۔

اور ساتھ ہی ایک خاص انداز سے دروازے پر دستک دی۔ اب میرے مفر کی کوئی صورت نہ تھی۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن والا معاملہ تھا۔ میں نے جھٹ پلنگ کی چادر کھینچ کر اپنے اوپر اوڑھ لی۔ اور ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئی۔ حبیب میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ گو میں چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ مگر پھر بھی اپنے ہونے والے شوہر کو قریب دیکھ کر مارے شرم کے زمین میں گڑ گئی۔ اور اس کی بے وقت آمد کے متعلق کچھ نہ کہہ سکی۔ آخر اس نے خود ہی سلسلۂ کلام کا آغاز کیا۔

حبیب۔ زیتون میں معافی کا خواستگار ہوں۔ میں نے بے وقت آکر تمہیں تکلیف دی۔ مگر میری اور تمہاری دونوں کی زندگی کا سوال تھا۔ اس لئے میں نے تم سے ملنا ضروری سمجھا۔ میں تمہیں ایک خطرے سے آگاہ کرنے آیا ہوں۔ (مجھے خاموش پا کر) اچھی زیتون۔ یہ بے جا شرم کا وقت نہیں۔ میری بات غور سے سنو۔ میں بہت مخلصانہ انداز سے

سے تمہارے پاس آیا ہوں ۔ میں تمہیں مطلع کرنا چاہتا ہوں ۔ کہ تمہارے والدین میرے ساتھ تمہاری شادی کر کے تمہیں اندھے کنوئیں میں دھکیل رہے ہیں ۔ میں تمہارے ساتھ ہرگز نباہ نہ کر سکوں گا ۔ کیونکہ یہ شادی میری مرضی کے خلاف ہے ۔ تم تعلیم یافتہ ہو ۔ خود سوچو کہ ایسی شادیوں کے نتیجے کتنے افسوسناک ہوتے ہیں ۔ (پھر میری مسلسل خاموشی سے اکتا کر) نادان لڑکی، یہ خاموشی تمہارے لئے اچھی نہیں ۔ سخت پچھتاؤ گی مجھے ایک عورت سے محبت ہے ۔ تمہارے ساتھ شادی کر کے مجھے تم سے کبھی محبت نہیں ہو سکتی ۔ تم پڑھی لکھی ہو ۔ تمہیں مجھ سے اچھا خاوند مل جائے گا ۔ ابھی تمہارے لئے موقعہ ہے کہ اس شادی سے انکار کر دو ۔

میں نے بڑی مشکل سے کپکپاتے ہوئے کہا ۔

" اگر آپ کا یہی خیال ہے تو پھر آپ خود ہی انکار کیوں نہیں کر دیتے ۔ کہیں کنواری لڑکیاں بھی والدین سے ایسا کہہ سکتی ہیں ۔

حبیب ۔ میں تو سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا ہوں ۔ اور انکار کرتے کرتے عاجز آگیا ہوں ۔ مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے ۔

مجھے انکی باتوں پر غصہ تو بہت آیا ۔ مگر میں برداشت کر گئی ۔ کیونکہ میں

اپنی خوبصورتی کے زعم میں تھی۔ مجھے یقین کامل تھا۔ کہ یہ ذاتِ شریف جو اتنی بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہے ہیں میری صورت دیکھتے ہی رشیہ خطمی ہو جائیں گے۔ پھر اس وقت ان باتوں کے بدلے لوں گی۔ دوسرے اس بڑھیا کے الفاظ بھی میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ کہ شوہر عاشقِ زار ہوگا۔ اس لئے میں نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا" میرے والدین کو اختیار ہے۔ مجھے اندھے کنوئیں میں دھکیلیں یا بھاڑ میں جھونکیں میں راضی برضا ہوں۔

حبیب۔ اچھا میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ آگے ماننا نہ ماننا تمہارے اختیار میں۔ اپنی زندگی برباد کرنے کی تم خود ذمہ دار ہو۔ یہ کہہ کر وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اور پیچ وتاب کھانے لگا۔

(۶)

میری شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ مدّتوں کے ارمان نکالے گئے۔ خوب دل کھول کر روپیہ صرف کیا گیا۔ ہر ایک فریق کی یہ آرزو تھی۔ کہ شادی ایسی شان وشوکت سے ہو کہ جس کی یاد مدتوں تک لوگوں کے دلوں میں باقی رہے۔ خیر یہ سب کام تو بخیر وخوبی انجام پذیر ہو گئے مگر حبیب نے جو کچھ زبان سے کہا تھا اس کو کر دکھایا۔ یعنی حبیب

میں سسرال پہنچی۔ تو وہ پُر اسرار طریقہ سے غائب ہو گیا۔

اُس کے والدین کے لئے سخت مصیبت کا سامنا تھا۔ ادھر اکلوتے بیٹے کی گمشدگی اور ادھر جگ ہنسائی۔ کچھ کرتے دھرتے نہ بن پڑتی تھی۔ خالو جان نہایت عقلمند اور وضع کے پابند تھے۔ انہوں نے بڑے حوصلے سے کام لیا۔ اور اس راز کو اس خوش اسلوبی سے چھپایا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ میرے والدین بھی سخت پشیمان تھے۔ مگر رسوائی کے خیال سے زبان تک نہ ہلا سکتے تھے۔ جب سارے مہمان چلے گئے تو حبیب کی تلاش شروع ہوئی۔ گردو نواح کے سب شہروں کا کونا کونا چھان مارا۔ مگر اس کا پتہ نہ چلا۔ آخر کار چار ماہ کے بعد خالو جان کے ایک دوست کا خط آیا کہ حبیب شملہ میں ہے۔ یہ خط کیا تھا ابر رحمت تھا۔ جس نے مردہ تنوں میں جان ڈالدی سوکھے دھانوں کو پانی مل گیا۔

خالو جان فوراً شملہ پہنچے۔ اور حبیب سے واپس چلنے کے لئے کہا سنا گیا۔ مگر حبیب نے آنے سے صاف انکار کر دیا۔ اور کہا جس گھر میں زیتون ہو گی۔ اس گھر میں وہ ہرگز قدم نہ رکھے گا۔ خالو جان بچارے اپنے کئے پر بہت نادم تھے۔ مگر اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت، مجبور تھے۔ نہ بیٹے

کو چھوڑ سکتے تھے۔ اور نہ بہو سے منحرف ہو سکتے تھے آخر بڑی مشکل سے حبیب اس شرط پر واپس آیا کہ وہ زیتون سے بالکل الگ رہے گا اس کی موجودگی میں اسے زنان خانے میں آنے پر مجبور نہ کیا جائیگا۔ وہ باہر مردانے ہی میں رہائش رکھے گا۔ اور بغیر اس کی اجازت کے کوئی اس کے کمرے میں نہ جائے گا۔

میں بھی سسرال ہی میں رہتی تھی۔ خالہ جان حبیب کی اتنی سرد مہری دیکھ کر مجھے زیادہ چاہنے لگی تھیں۔ اور اپنے بیٹے کی بے رُخی کی تلافی اپنی محبت اور الفت سے کرنا چاہتی تھیں۔ امّی جان بھی آگے سے زیادہ میری ناز برداریاں کرتیں۔ میں نے بھی کبھی ملال کا اظہار نہ کیا۔ کیونکہ مجھے خطرہ تھا کہ اگر ان دونوں گھرانوں کی آپس میں اَن بَن ہو گئی تو میں اپنے حسن کے دیوتا حبیب کے دیدار سے محروم ہو جاؤں گی۔ گو حبیب کے اس حقارت آمیز سلوک سے میرے نسوانی غرور کو بُری طرح ٹھیس لگی۔ اور میرے برق پاش حسن کو شکستِ فاش ہوئی۔ مگر جتنا اس کی طرف سے نفرت کا اظہار ہوتا۔ اتنی ہی اُس کی محبت میرے دل میں گھر کرتی جاتی تھی۔ میں اُس چھوٹی سی کھڑکی سے جو ایک نیم چھت کمرے میں سے حبیب کے کمرے میں کھلتی تھی چلمن کے پیچھے کھڑی ہو کر کبھی کبھی حبیب کو دیکھ لیا کرتی۔

امّی جان اور خالہ جان نے ہمارے ملاپ کے لئے بہتیرے ٹونے ٹوٹکے بھی کئے۔ مگر انہوں نے کبھی بھول کر بھی میری دہلیز پر قدم نہ رکھا۔ آخر کار میرے والدین نے میرے اصرار سے مجھے کالج میں داخل کرا دیا۔ تعلیم کے شغل میں میرا دھیان بہت کچھ بٹ گیا۔ اور میں اپنی قسمت پر شاکر رہتی۔

ایک دفعہ خالو جان نے حبیب کا دل ٹٹولنے کے لئے اس سے کہا

خالو جان۔ حبیب تمہارے اس مجنونانہ انداز سے ہماری خاندانی کو بٹہ لگتا ہے۔ اگر تمہیں کسی لڑکی سے محبت ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں اس کے ساتھ تمہاری شادی کر دوں۔ زیتون بڑی اچھی لڑکی ہے۔ وہ تمہاری خوشی کے لئے ہر ممکن ایثار کو تیار ہو جائے گی۔

حبیب۔ ابّا جان! میں اپنی محبوبہ کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ نہ میں نے کبھی اُسے دیکھا ہے۔

خالو جان۔ (تعجب سے) حبیب میرے ساتھ مذاق کر رہے ہو۔ اگر تم نے اُسے دیکھا ہی نہیں تو پھر یہ حال کیوں بنا رکھا ہے

حبیب۔ ابا جان! مذاق نہیں۔ درحقیقت میں اُسے نہیں جانتا وہ میرے تخیّل کی ملکہ ہے۔

خالو جان۔ تخیّل کی ملکہ۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا یعنی......

حبیب - یعنی میرا تخیل ایک ایسی لڑکی کی تصویر پیش کرتا ہے جس پر میں گرویدہ ہوں۔

خالو جان۔ اچھا تم ایک خیالی تصویر پہ عاشق ہو۔ کبھی پُرانے زمانے کے قصّے کہانیوں میں ایسی بیہودہ باتیں سننے میں آتی تھیں۔ اب آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ آہ حبیب میرے پیلٹے بچے یہ تمہارا قصور نہیں یہ میری قسمت کا قصور ہے تم سا ہونہار لڑکا پاگل ہو جائے تو والدین کی انتہائی بدبختی نہیں تو اور کیا ہے۔ میرا ارادہ ہے کسی ڈاکٹر سے تمہارا علاج کرایا جائے۔

حبیب۔ جیسے آپ کی مرضی۔

(۷)

میری شادی کو پانچ سال گذر گئے۔ مگر حبیب کی حالت میں فرق نہ آیا وہ بدستور خاموشی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کا محبوب شغل مصوّری تھا۔ جس کی مشق وہ دن رات کیا کرتا تھا۔ آج تک اس کا کوئی شاہکار کسی کی نظر سے نہ گذرا تھا۔ ہم لوگ اس کی بے اعتنائی کے اتنے خوگر ہو چکے تھے کہ اس کو بالکل اس کی حالت پر چھوڑ رکھا تھا میں اب بی اے میں پڑھتی تھی۔ میرا سالانہ امتحان شروع تھا۔ اور

آج کل میکے آئی ہوئی تھی۔ جس دن میں آخری پرچہ کر کے آئی۔ راستے میں مجھے سردی محسوس ہوئی اور گھر آتے ہی مجھ پر بخار کا سخت حملہ ہوا۔ معمولی ملیریا سمجھ کر علاج وغیرہ کیا گیا۔ مگر جب چار دن تک بخار نہ اترا تو گھر والوں کو فکر پڑ گئی۔ حکیموں ڈاکٹروں کا تانتا لگ گیا۔ مگر بخار کسی طرح نہ اُترا۔ آخر خالو جان کی رائے کے مطابق ڈاکٹر بسطام خاں کو بلایا گیا۔

ڈاکٹر بسطام خاں خالو جان کے لنگوٹیے یار اور بڑے قابل ڈاکٹر تھے۔ مجھے دیکھ کر ایک دبی چیخ اُن کے منہ سے نکل گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر خاموش اور سٹپٹائے ہوئے نسخہ لکھ کر چلے گئے۔ خدا کی قدرت بسطام خاں کی دوا سے مجھے رات کو بحران ہوا اور بخار ٹوٹ گیا۔ بسطام خاں روزانہ آتے تھے۔ مگر تین چار دن تک اُنہوں نے مجھ سے کسی خاص معاملہ کے متعلق بات چیت نہ کی۔ البتہ ابّا جان سے کچھ دریافت کرتے رہے۔ آخر جب میں صحتیاب ہو گئی تو ایک دن بسطام خاں مجھ سے کہنے لگے ——

بسطام خاں زیتون جب پہلے دن میں نے تمہیں دیکھا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ تم ایک ایسی عورت سے مشابہ ہو جس کو میں آج سے بیس برس پہلے جانتا تھا۔ اگر تم نوعمر نہ ہوتیں۔ تو میں یہی سمجھتا کہ تم وہی فرخندہ جبیں ہو۔

میں۔ فرخندہ جبیں!

بسطام خاں۔ ہاں کیا تم اس کو جانتی ہو؟

میں۔ ہاں، میں اس کی بیٹی ہوں۔

بسطام خاں۔ فرخندہ جبیں کی بیٹی۔ تمہاری ماں کہاں ہے؟

میں۔ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔

بسطام خاں۔ کیا تمہاری اور بہن بھی تھی جس کا نام یاسمین تھا؟

میں نے اپنی کلائی ان کے سامنے رکھ دی۔ "یاسمین اظہر علی" لکھا دیکھ کر بسطام خاں کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اور میری ماں کے متعلق دیر تک باتیں کرنے کے بعد رخصت ہو گئے۔ میں نے ہر چند کرید کرید کر دریافت کیا۔ کہ وہ کون ہیں اور کس طرح میری ماں سے ان کی واقفیت ہوئی مگر وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔

(۸)

اس واقعہ کو ڈیڑھ دو مہینے گذر گئے۔ خالہ جان اور خالو جان مجھے لینے کے واسطے آئے ہوئے تھے۔ ہم سب خوش و خرم بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اتنے میں ملازم لڑکا ایک ملاقاتی کارڈ لے کر اندر آیا۔

ابا جان۔ (کارڈ دیکھ کر) ڈاکٹر اظہر علی صاحب تشریف لائے ہیں۔

میں یہ سن کر چونک پڑی۔ ابا جان باہر چلے گئے۔ اور چائے کے لئے کہہ گئے۔ میں نے چائے بھجوا دی۔ پھر امی جان سے پوچھا۔

"امی جان! اظہر علی صاحب کون ہیں؟"

امی جان۔ یہ تمہارے خالو جان کے چھوٹے بھائی ہیں۔ اور حبیب کے سگے چچا۔

میں۔ (تعجب سے) مگر میں نے ان کا نام کبھی نہیں سنا۔ اور نہ یہ کبھی ہمارے گھر آئے ہیں۔

امی جان۔ ان کی بیوی بڑی سخت گیر ہے۔ شوہر کے رشتہ داروں سے میل جول رکھنا پسند نہیں کرتی۔ تمہاری خالہ جان اور خالو جان کے برخلاف ہر وقت ان کے کان بھرتی رہتی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اظہر علی بھائی بھاوج کی صورت دیکھنے سے بھی بیزار ہو گئے۔ اور اُن سے قطع تعلق کر کے علیحدہ کوٹھی میں چلے گئے۔ پندرہ برس ہوئے دونوں بھائی ایک دوسرے کو نہیں ملے۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ابا جان خوش خوش اندر آئے اور امی جان اور خالہ جان سے کہنے لگے۔ "آپ ذرا پردے میں ہو جائیں" وہ دونوں اندر چلی گئیں۔ میں بھی جانا چاہتی تھی۔ مگر ابا جان نے کہا۔ "زینوتم یہیں ٹھہرو" میں ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

اتنے میں ایک ادھیڑ عمر کے آدمی جو بالکل حبیب کے ہمشکل تھے ابا جان کے ساتھ اندر آگئے۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر بسطام خاں بھی تھے۔ بسطام خاں کو دیکھ کر سارا معاملہ میری سمجھ میں آگیا۔ نووارد شخص نے آتے ہی میرے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اور مجھے آغوش میں لے کر رونے لگے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر ابا جان تسلیاں دینے لگے۔

ابا جان۔ ڈاکٹر صاحب یہ رونے کا وقت نہیں۔ خدا کا شکر کیجئے جس نے آپ کی بچی کو آپ سے ملا دیا۔

ڈاکٹر صاحب۔ میری لخت جگر زیتون! مجھے معاف کر دو۔ میں نے تم لوگوں کو بہت دُکھ دیا۔ مگر اس میں میرا کچھ قصور نہیں۔ مجھے ایک شیطان نے بہکایا تھا۔ میں کانوں کا کچّا تھا۔ اس کے چکموں میں آگیا۔ اب اپنے کئے پر سخت نادم ہوں۔

بسطام خاں۔ عزیز بچی۔ تمہارا باپ محض بے قصور ہے وہ شیطان میں ہوں میں نے اس فرشتہ خصلت اور معصوم فرخندہ جبیں پر جھوٹی تہمت لگا کر تمہارے باپ کو اس سے برگشتہ کیا تھا۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ میں فرخندہ جبیں کا دشمن تھا۔ بلکہ یہ فعل میں نے تمہارے بوڑھے دادا کی خاطر کیا تھا۔ جو تمہارے باپ سے بہت محبّت رکھتے تھے۔ اور ان کے فراق میں رو رو کر اندھے ہو رہے تھے

میں۔ اچھا جو قدرت کو منظور تھا، ہوا۔ اس میں کسی کا قصور نہیں
تھوڑی دیر کے بعد بسطام خاں چلے گئے تو ڈاکٹر صاحب نے خالہ جان
سے معافی مانگی۔ مدتوں سے بچھڑے ہوئے بھائی گلے ملے۔ بغض و
عداوت کا خاتمہ ہوا۔ ہر طرف مبارک سلامت ہو رہی تھی۔ کئی دن
تک خوشیاں رہیں۔

(۹)

اب میں ڈاکٹر صاحب کے اصرار پر مہینہ میں ایک دو دفعہ ان
کے گھر جاتی۔ مگر میری اماں جان میرے ساتھ جاتی تھیں۔ اور مجھے ایک
یا دو دن سے زیادہ وہاں ٹھہرنے نہ دیتی تھیں۔ کیونکہ میری وجہ سے میری
سوتیلی ماں کا اقتدار کم ہو گیا تھا۔ اور وہ میرے خون کی پیاسی ہو رہی
تھی۔ ڈاکٹر صاحب خود ہر وقت امی جان کے گھر یا خالہ جان کے گھر
جہاں میں موجود ہوتی، رہتے۔ اب میں تینوں گھرانوں پر حکمران تھی۔ ہر طرف
میرا ہی دور دورہ تھا۔ دولت، عزت، مسرت اور حکومت میری ادنیٰ
کنیزیں تھیں۔ مگر ایک خار تھا جو میرے دل میں کھٹکتا تھا۔ ایک پھانس
تھی جو میرے کلیجے میں چبھتی تھی۔ ایک آگ تھی جو میرے سینے میں سلگ
رہی تھی۔ یہ انتشار اور اندرونی خلش صرف اُس ہستی کے طرزِ عمل کی وجہ

سے تھی۔ جس کی اُلفت میرے دل و دماغ پر حاوی تھی۔

دو فروری کا دن میری زندگی میں نہایت مبارک تھا۔ صبح میں نور کے تڑکے بیدار ہوئی۔ آج مجھے بی۔ اے کی ڈگری ملنے والی تھی۔ بارہ بجے میں ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ اپنے کالج کو چلی گئی۔ دو بجے کے قریب جب واپس آئی تو گھر سنسان پڑا تھا۔ ملازمہ سے معلوم ہوا کہ حبیب کو یکایک کوئی دورہ پڑا ہے۔ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ اور سب لوگ اُس کے پاس گئے ہوئے ہیں۔ یہ سُن کر میں بے تاب ہو گئی اور بے سوچے سمجھے دوڑتی ہوئی نیچے چلی گئی۔ حبیب ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اُس کی آئینہ نما فراخ پیشانی چاند کو شرما رہی تھی۔ اس کے سیاہ ریشمی بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے نہایت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ اس کی ہرن کی سی آنکھیں اور ہلال نما خم دار ابرو غضب ڈھا رہے تھے اس کا حسنِ خداداد کسی تصنع کا محتاج نہ تھا۔ اس کے خوبصورت مگر پُر رعب چہرے پر پاکبازی اور معصومیت کا نور جھلک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تصویر تھی۔ جس کو دیکھ کر وہ مجنونانہ قہقہے لگا رہا تھا۔ اس کے والدین اس کی یہ حالت دیکھ کر زار زار رو رہے تھے۔ جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو سب کی نگاہیں میری جانب اُٹھ گئیں حبیب نے بھی مجھے دیکھا۔

یہ پہلا دن تھا۔ کہ میرا اُس کا سامنا ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ تصویر اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اور اس کی نرگسی آنکھیں کٹورے کی طرح کھُل گئیں۔ اتنی بڑی اور دلکش آنکھیں میں نے کبھی نہ دیکھی تھیں۔ نگاہوں کا باہم ملنا تھا کہ میری آنکھیں حجابِ نسوانی سے خود بخود جھک گئیں۔

میں لجاتے ہوئے پیچھے ہٹی۔ مگر حبیب "آہ میرے تخیل کی ملکہ" کہتا ہوا میری طرف دوڑا۔ اور میرے قدموں میں گر کر بے ہوش ہو گیا۔ میں مبہوت کھڑی تھی۔ اس کو پلنگ پر لٹایا گیا۔

تصویر اٹھا کر دیکھی گئی۔ تو ہمارے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ یہ میری ہی تصویر تھی۔ جس کو اس نے اپنے زورِ تصور سے بنایا تھا۔

لاشوں کا شہر

اس پُراسرار دنیا میں بعض لوگوں کو ایسے واقعات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جن کی تفصیل سن کر عقل دنگ رہ جاتی ہے ....

.... میں لوگوں کی انگشت نمائی کے خیال سے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ لیکن بقول چراغ ؎ "جب میرے سفید بال اس پُرہول واقعہ کی یادگار میرے پاس موجود ہیں۔ تو پھر کیوں نہ ان کو عوام کے سامنے دُہرا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر دوں۔"

.... میرا نام مشتاق احمد اور وطنِ مالوف مظفر گڑھ ہے۔ میرے والد حکیم تھے۔ ہم دو بھائی بہن تھے۔ میری بہن کا نام ذکیہ تھا۔ وہ مجھ سے چھ سال بڑی تھی۔ مگر بے حد شریر اسے جانور پالنے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ اس نے کئی خرگوش اور گلہری کے بچے پال رکھے تھے۔ ہم دونوں بہن بھائی کی آپس میں بہت محبت تھی جب میں ذرا بڑا ہوا۔ تو اس نے اپنی شرارتوں میں مجھے بھی شامل کر لیا۔ وقت گذرتا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم بھی بڑے ہوتے گئے حتیٰ کہ میں نو سال کا ہو گیا۔ اور ذکیہ پندرہ سال کی۔

ہمارا مکان بازار میں تھا۔ جس کی نچلی منزل میں ابا کا مطب تھا اور بالاخانے پر ہماری رہائش تھی۔ بالاخانے کی کھڑکیوں کے قریب باہر کی طرف ابا کے مطب کا سائن بورڈ لگا تھا۔ ایک دفعہ کسی شامت کی ماری چمگادڑ نے اس سائن بورڈ کے پیچھے بچے دیئے۔ اور اتفاقیہ ذکیہ کی نظر ان پر جا پڑی۔ بس پھر کیا تھا وہ اس کا بچہ چھیننے پر آمادہ ہو گئی اس نے اس کام میں مجھے بھی شریک کرنا چاہا۔ مگر میں نے آج سے پیشتر یہ جانور کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس لئے ڈر کر انکار کر دیا......... میرے انکار پر وہ بہت برافروختہ ہوئی۔ اور مجھ سے روٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ تاہم اس کی چنچل طبیعت میں سکون کہاں تھا۔ تھوڑی دیر

بعد ابّا کی چھڑی ہاتھ میں لئے پھر آموجود ہوئی۔ میں اس خیال سے کہ شاید مجھے پیٹنے آئی ہے بھاگ کر دور جا کھڑا ہوا۔

گرمیوں کا موسم اور دوپہر کا آتشیں وقت تھا۔ آفتاب کرۂ نار بنا ہوا تھا۔ در و دیوار تپش سے سیاہ ہو رہے تھے۔ ذکیہ کا چہرہ کچھ گرمی اور کچھ غصّہ سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ وہ منہ سے کچھ بڑبڑاتی اور مجھے ملامت آمیز نگاہوں سے گھورتی ہوئی کھڑکی میں ایک ٹانگ باہر کی طرف لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اور جھک جھک کر اس مضبوط چھڑی سے چمگادڑ اور اس کے بچوں کو کچوکے دینے لگی۔ میں وہیں کھڑا تھا۔ لیکن ان جانوروں کی آواز برابر سنائی دے رہی تھی۔

وہ اپنے کام میں مصروف تھی۔ حتیٰ کہ چمگادڑ تنگ آکر بچوں کو وہیں چھوڑ پروں کو پھڑپھڑاتی ہوئی اڑی۔ بچّے بے چارے بغیر ماں کے سسکنے لگے۔ ذکیہ فوراً دست پناہ لے آئی۔ اور ایک بچّے کو اٹھا کر چھوٹے سے پنجرے میں ڈال دیا۔

دن بھر تو وہ چمگادڑ غائب رہی۔ مگر شام ہوتے ہی اپنے گھونسلے میں واپس آگئی اور بچّے کو وہاں نہ پایا۔ تو کھڑکی کے ذریعے کمرے میں گھس کر چکّر کاٹنے شروع کر دیئے۔ طاقچے میں پنجرا پڑا تھا۔ وہ بار بار پنجرے پر جھپٹتی اور ناکام واپس جاتی۔ ذکیہ نے بہت کوشش کی کہ وہ

کسی طرح باہر نکل جائے۔ لیکن وہ نہ ٹلی۔ ایک بار جب وہ پنجرے پر جھپٹی تو ذکیہ نے اس پر اس زور سے چھڑی کا وار کیا۔ کہ چمگادڑ بیدم ہو کر گر پڑی۔ اور ذکیہ نے چھڑی کی مزید ضربوں سے اُسے ہلاک کر دیا۔ .... خدا کی قدرت اسی رات ذکیہ تپ محرقہ میں مبتلا ہو گئی۔ اور گیارھویں دن گوشہ قبر میں جا سوئی۔ مجھے اس کی موت کا بے حد صدمہ ہوا۔

(۲)

اس واقعہ کو اٹھارہ سال گذر گئے۔ میرے والدین سفرِ آخرت کر چکے تھے۔ اب میں خود حکیم تھا۔ مجھے اپنے کام میں خاص دلچسپی تھی۔ اور میں جڑی بوٹیوں کی تحقیقات کا بڑا شائق تھا۔ ہمارا پُرانا ملازم چراغ اس کام میں میرا معاون تھا۔ چراغ مجھ سے دس سال بڑا تھا۔ ابّا نے اس کو یتیم خانے سے لے کر پرورش کیا تھا۔ اور اسے اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔ یہ شخص بڑا وفادار تھا۔ اور مجھ سے بہت محبت کرتا تھا اس وقت میری عمر ستائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اور چراغ کی تقریباً سینتیس سال تھی۔

میں اور چراغ اکثر بوٹیوں کی تلاش میں جنگلوں اور بنوں میں مارے مارے

پھرا کرتے۔ میں نے کئی نئی بوٹیاں دریافت کیں۔ جن کی عجیب و غریب خاصیت نے میری حکمت کو چار چاند لگا دیئے۔

اسی غرض سے ایک دفعہ میں نے جموّں کا سفر کیا۔ اور تین چار ماہ تک اس علاقہ میں نئی نئی بوٹیاں دریافت کرتا ہوا بوٹ تک جا پہنچا۔ چراغ اس سفر میں بھی میرے ہمراہ تھا۔ اور میرے آرام کا بہت خیال رکھتا تھا۔ میرے پاس تین گھوڑے تھے۔ جن میں سے ایک پر میں خود سوار ہوتا۔ اور باقی دونوں پر سامانِ باربرداری لادا جاتا۔ چراغ ایک پہاڑی ملازم لچھّو کے ہمراہ ہمیشہ پیدل چلا کرتا۔

لچھّو قصبہ ردھنی کا باشندہ تھا۔ جو رام بن سے دو سو میل جانب غرب ان دشوار اور پُرخطر پہاڑوں کے پیچھے تھا۔ جن کی برفانی چوٹیاں آسمان سے ملی ہوئی نظر آتی تھیں۔ دورانِ سفر میں ایک دن جب کہ جڑی بوٹیوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ لچھّو نے مجھے بتایا کہ ردھنی کے قریب جنگلوں میں ایک پودا ملتا ہے۔ جس کی جڑ کی خوشبو سے شیر مست ہو جاتا ہے۔ پہاڑی لوگ شیر سے بچاؤ کی خاطر اکثر اس جڑ کو اپنے پاس رکھتے ہیں۔

اور اس نے یہ بھی بتایا کہ موضع ردھنی سے بیس میل پرے ایک قصبہ باتھری آباد ہے۔ یہ مسلمانوں کی بستی ہے۔ اس گاؤں کے گرد و نواح میں روشنی دینے والے درخت پائے جاتے ہیں۔ اس درخت کو

پہاڑی زیدان کا درخت کہتے ہیں. اس کی روشنی سفید اور شفاف ہوتی
ہے. لوگ اس کی ٹہنیاں کاٹ کر گھروں میں بطور چراغ کے استعمال کرتے
ہیں. اس کے علاوہ اس علاقہ کے غاروں میں ایک خاص قسم کی گھاس
پیدا ہوتی ہے. جس کو بھگویا جائے تو اس سے دھواں نکلنا شروع ہو جاتا ہے
اور گرد و پیش کئی گز تک دھند سی چھا جاتی ہے. لیکن باہر کا کوئی آدمی بھی
باتھری جانا پسند نہیں کرتا. کیوں کہ اس گاؤں کے قریب ہی بھوتوں کا ایک
قصبہ آباد ہے. گو اُن لوگوں نے بھوتوں کی روک تھام کے لئے بہت
کچھ انتظام کر رکھا ہے. پھر بھی ان کو بھوت تنگ کرتے رہتے ہیں.

لچھو کی زبانی اس انوکھے گاؤں اور اس کے عجیب و غریب پودوں
کا حال سن کر مجھے سخت حیرت ہوئی. میں تمام دن اُسی گاؤں کے متعلق
سوچتا رہا. اُس رات میں نے ایک خواب دیکھا. کہ میں اور چراغ ایک
خوبصورت پہاڑی پر کھڑے تھے. جس کے مقابل کی ایک دلفریب پہاڑی
پر ایک گاؤں آباد تھا. اور ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان کھڈ میں
ایک شور انگیز ندی کف اڑاتی اچھلتی ہوئی گذر رہی تھی.

اس کھڈ کے اوپر دو پل بنے ہوئے تھے. ایک پل گاؤں کی طرف
جاتا تھا. اور دوسرا ایک عالیشان مکان کے دروازے پر جا کر ختم ہوتا تھا
جو دوسری طرف عین کھڈ کے اوپر بنا تھا. اس مکان کا آدھا حصہ جو دمدمہ نما

تھا. نہایت کاریگری سے کھڈ کی طرف بڑھا کر دو پتھریلی چٹانوں کی چوٹیوں پر ایستادہ کیا گیا تھا. یہ چٹانیں جو اس دمدمے کے نیچے ستونوں کا کام دیتی تھیں. جہاں پانی گہرا مست ہاتھی کی طرح چٹانوں سے ٹکراتا ہوا جا رہا تھا. اس پل پر دمدمے کے قریب میری بہن ذکیہ نہایت مغموم کھڑی تھی. اس کی گود میں ایک بچہ تھا. مجھے دیکھکر وہ نہایت عاجزی سے کہنے لگی "مشتاق مجھے بچاؤ" میں نے غم آلود لہجہ میں کہا "ذکیہ یہ کونسی جگہ ہے. اور تم یہاں کیسے آگئیں"؟ اس نے کہا "میں ذکیہ نہیں میرا نام شمشاد ہے. اس گاؤں کو باتھری کہتے ہیں. اور میں یہاں کی مظلوم رانی ہوں" میں اس کی مدد کو بڑھا. یک دم سخت آندھی چلی. وہ پل ٹوٹ گیا. اور ذکیہ کھڈ میں گر گئی. لیکن میں نے اس کے بچے کو پکڑ لیا.

اس دہشت ناک خواب کی گھبراہٹ سے میری آنکھ کھل گئی. میری پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی. میں بے قراری سے بستر پر کروٹیں بدلنے لگا. حتیٰ کہ مرغانِ سحر اذانوں پر اذانیں دینے لگے. صبح صادق کی دوشیزہ ہوائیں خیمے کے دروازے پر معصومانہ انداز سے کھیلنے لگیں. اور اُجالے کی دیوی کی آمد پر تاریکی کے بھوت کا رنگ پھیکا پڑنے لگا...... میں نے چراغ کو بلا کر اپنا خواب سنایا. اور اسے فوراً باتھری کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا. تھوڑی دیر بعد ہم یہاں سے روانہ ہو گئے.

ہمارا راستہ تنگ اور پیچ در پیچ تھا. جو ایک پُرخطر کھڈ کے کنارے ہوتا ہُوا پہاڑ کی ناہموار اور ناقابلِ عبور چڑھائی پر جا پہنچتا تھا. بعض گھاٹیاں اتنی دشوار گزار تھیں، کہ گھوڑے اپنے پاؤں زمین پر گاڑ گاڑ کر چلتے تھے. ان پہاڑوں میں آمد و رفت بہت محدود تھی. دورانِ سفر میں صرف دو دفعہ ہمیں پہاڑیوں کے وہ قافلے ملے. جو من ہیش کی طرف تیر تھ یاترا کرنے جا رہے تھے.

آخر تیرہ دنوں کی شبانہ روز صعوبتوں کے بعد ہم یہ راستہ طے کر کے روہنی کے دلکش گاؤں میں جا پہونچے. اس مسلسل اور کٹھن سفر کی تکان سے ہمارے بدن چور ہو رہے تھے. اس لئے کچھ دن ہم روہنی میں ٹھہرے. پھر ایک ہفتہ کے قیام کے بعد ہم لوگ باتھری کی طرف روانہ ہوئے. لچھو ہمارے ساتھ جانے کو تیار نہ تھا. مگر زیادہ تقاضا کرنے پر وہ ہماری درخواست رد نہ کر سکا یہ راستہ پہلے سے بھی زیادہ ناقابلِ گذر اور شکستہ تھا. بڑی دقتوں سے اسے طے کر کے دوسرے دن کہیں، دوپہر کے وقت ہم لوگ ایک کھلے میدان میں پہنچے. سامنے ایک خوبصورت ٹیلہ تھا. اس دیدۂ زیب میدان کو دیو دار کے شاندار درخت گود میں لئے کھڑے تھے. آفتاب عالم تاب کی تابانیوں سے میدان کا ذرّہ ذرّہ کوہِ نور کا ہمسر تھا. دھوپ اپنے پورے جوبن پر تھی. ٹھنڈی ہُوا کے متوالے جھونکے اس میدان کے خس و

خاشاک کی بلائیں لے رہے تھے۔ اس پرکیف منظر سے متاثر ہو کر ہم نے وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ اور کھانا جو پہلی منزل سے پکا کر ساتھ لائے تھے کھا کر آرام کرنے لگے۔

سہ پہر کو میں اور چراغ سیر کرتے ہوئے ٹیلے پر جا نکلے۔ دور سے ہمیں ایک عورت دکھائی دی۔ جو چیل کے سائے میں بیٹھی تھی۔ یہ ایک لمبے قد کی گرانڈیل اور مضبوط مگر بوڑھی عورت تھی۔ اس کے بال بہت دراز اور بالکل سفید تھے۔ جن کو کھولے ہوئے وہ کنگھی کر رہی تھی۔ چراغ جھجک کر کہنے لگا۔ بچپن کی کہانیوں میں بڑی بوڑھیوں سے سنا کرتا تھا۔ کہ ویران جنگلوں اور پہاڑوں میں چڑیلیں رہا کرتی ہیں۔ جن کے بال پاؤں کی ایڑیوں تک لمبے ہوتے ہیں.......... میں اس کی ضعیف الاعتقادی پر ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔ پاؤں کی آہٹ پا کر اس نے اپنے نقرئی تاروں کے سے سفید بال چہرے سے ہٹائے۔ اور میری طرف دیکھا۔ پھر پہاڑی زبان میں کہنے لگی — "تم لوگ کہاں کے رہنے والے ہو۔ اور یہاں کیسے آنا ہوا۔؟" میں نے کہا۔ "میں حکیم ہوں اور جڑی بوٹیوں کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ لیکن کیا تم اس ویرانے میں اکیلی رہتی ہو؟"

اس عورت نے گہرا سانس لیا۔ اور کہنے لگی۔ "نہیں میں موضع باتھری کی رہنے والی ہوں۔ جو یہاں سے تین کوس آگے ہے۔ میرا نام فرزانہ ہے

میں بے اولاد ہوں۔ اس وجہ سے گاؤں کی کئی بے رحم عورتیں مجھے منحوس خیال کرتی ہیں۔ اور میرے شوہر کو میرے خلاف بھڑکاتی رہتی ہیں۔ میرا شوہر نبی خاں بہت سخت گیر آدمی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر مجھے بری طرح زدوکوب کرتا ہے۔ بعض اوقات اس کی سختیوں سے تنگ آکر میں اس جنگل میں آجاتی ہوں۔ اور کچھ دن بعد جب اس کا غصہ سرد پڑ جاتا ہے تو واپس چلی جاتی ہوں۔

اُس نے مجھے اپنے بازو اور شانے دکھلائے۔ جن پر بڑے بڑے نیلے داغ تھے۔ یہ اُس کے شوہر کے وحشی پن کا ثبوت تھا۔ مجھے اس پر بڑا رحم آیا۔ وہ مجھے اپنا ہمدرد پاکر کہنے لگی۔ پہلے تو میں اس ظلم وستم سے بہت گھبراتی تھی مگر جب سے مجھے ایک رشی نے بشارت دی کہ تیرا بیٹا ایک دن گاؤں کا سردار ہوگا۔ تب سے مطمئن ہوں۔ گو میں جانتی ہوں کہ میری عمر بچہ پیدا کرنے کی نہیں۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ رشی کی پیشین گوئی ضرور پوری ہوگی۔

فرزانہ بہت نیک دل اور باادب عورت تھی۔ میں نے اُس سے باتھری کے حالات اور بھوتوں کے متعلق دریافت کیا۔ اُس نے بتایا۔ کہ بیشک یہ قصبہ بھوتوں کے ظلم وستم کی آماجگاہ بنا ہُوا ہے۔ اس کی وجہ موجودہ سردار کا انتہائی ظلم ہے۔ جو اس نے گاؤں کے اصلی وارث اور

اس کے حامیوں پر کیا تھا۔

پھر کہنے لگی.......... آج سے نصف صدی پیشتر موضع باتھری ان کالے کالے اونچے پہاڑوں کے درمیان ایک وادی میں آباد تھا۔ اس گاؤں کی آبادی تقریباً تین ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔

اس وقت موجودہ سردار کا چچا نعمان خاں گاؤں کا حاکم تھا۔ اس سردار کو شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ جب وہ شکار کو جا رہا تھا۔ اس کا گھوڑا ایک دشوار گذار گھاٹی سے بھڑکا، اور سوار سمیت کھڈ میں گر کر ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد نعمان خاں کا چھوٹا بھائی (یعنی موجودہ سردار کا باپ) رمضان خاں یہاں کا عارضی حاکم بنایا گیا۔ کیونکہ متوفی سردار کا لڑکا ہمدان خاں صرف ایک سال کا بچہ تھا۔ پھر تیرہ سال بعد جب رمضان خاں کا انتقال ہوا تو اس کے لڑکے سلطان خاں نے جو ہمدان خاں سے پانچ سال بڑا تھا۔ ہمدان خاں کو زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ اور خود حاکم بن بیٹھا۔ اس پر ہمدان خاں کے حامیوں نے شورش مچائی۔ تو سلطان خاں نے ان کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔

بس اُس دن سے موضع باتھری پر تباہ آ گئی۔ یعنی تمام بے گناہ مقتولوں کی روحیں بھوت بن کر گاؤں والوں کو ستانے لگیں۔ اور انہیں بھوتوں کی چیرہ دستیوں سے تنگ آکر ایک دیّے کے راستے اپنی رعایا

کے ساتھ بھاگ آیا۔ پہاڑ کے اس طرف ایک جگہ موجودہ باتھری آباد کیا۔ پھر اس پہاڑی درّے کو ایک پتھریلی دیوار بنا کر جو کئی گز اونچی ہے۔ بند کر دیا۔ اب یہ بھوت گاؤں میں تو نہیں آتے۔ لیکن جب کوئی مر جاتا ہے تو اس کی لاش کو قبر سے نکال کر کھا جاتے ہیں۔

میں نے کہا فرزانہ باتھری کے لوگ مسافروں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں۔ فرزانہ کہنے لگی۔ بھوتوں کے ڈر سے اس طرف کوئی مسافر آتا ہی نہیں۔ البتہ کبھی کبھی کشمیری سوداگر آ کر حسین لڑکیاں سردار کے پاس فروخت کر جاتے ہیں۔ ان کے لئے سردار نے ایک مہمان خانہ بنوا رکھا ہے۔ تم حکیم ہو۔ اگر عمدہ عمدہ دوائیں سردار کو تحفہ دو گے۔ تو تمہاری بہت قدر کرے گا۔

(۴۳)

شام کے قریب ہم لوگ فرزانہ کی معیت میں باتھری کی طرف روانہ ہو کر ایسی جگہ پہنچے جہاں خواب کا سارا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ ہم لوگ اس وقت ایک ایسی پہاڑی پر کھڑے تھے۔ جس کے مقابل کی دوسری پہاڑی پر گاؤں آباد تھا۔ وہی ندی، وہی کھڈ، وہی دو پُل، وہی دمدمہ تمام مکان جس کا آدھا حصہ کھڈ کے درمیان سنگی چٹانوں پر

قائم تھا۔ میں بھو چکا سا ہو کر خواب والی حسین لڑکی کی جستجو میں اُس خوبصورت پل کی طرف دیکھنے لگا۔ جو اس عمارت کے دروازے پر جا کر ختم ہوتا تھا۔ مگر وہاں کچھ دکھائی نہ دیا۔

فرزانہ میری بدحواسی پر بہت متعجب ہوئی۔ میں دیر تک پاگلوں کی طرح کھڑا اِدھر اُدھر کے مناظر دیکھتا رہا.......... شام کافی تاریک ہو جانے پر ہم باتھری میں داخل ہوئے۔ لچھو اور گھوڑوں کو فرزانہ نے اپنے مویشی خانہ میں جگہ دی۔ میں اور چراغ رات کو مسجد میں سوئے۔

صبح کے وقت مسجد کے مولوی سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے اُسے اپنا پیشہ اور یہاں آنے کی وجہ بتائی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اور جمعہ کے دن مجھے سردار سے ملانے کا وعدہ کیا۔ اس مولوی کا نام عبدالصمد تھا۔ گاؤں میں اس کی بہت عزت تھی۔ اُس کا رتبہ سردار کے دوسرے درجہ پر سمجھا جاتا تھا۔ وہ ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ اور بہت تواضع سے پیش آیا.......... تین دن تک ہم لوگ مولوی عبدالصمد کے مہمان رہے۔ چوتھے دن جمعہ کی نماز کے بعد اُس نے سردار سے میرا تعارف کرایا۔ سردار جس کی عمر دراصل پچپن اور ساٹھ سال کے درمیان تھی۔ چالیس سال کا ایک مضبوط اور طاقتور آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کا رنگ سفید اور نقش و نگار بھدے تھے۔ بشرے سے رعونت ٹپکتی تھی۔

میرے دل میں اس کی طرف سے نفرت پیدا ہوگئی۔ وہ میرے باتھری آنے کے متعلق دیر تک گفتگو کرتا رہا۔ میں نے دواؤں کا ایک بکس اس کو بطور نذر پیش کیا۔ اس تحفہ سے وہ اتنا خوش ہوا کہ مجھے شاہی مہمان قرار دے کر شاہی مہمان خانے میں رہنے کا حکم دیا گیا۔

شاہی مہمان خانہ دہی دو منزلہ عمارت تھی۔ جو کھڈ کے اوپر بنی ہوئی تھی۔ خوبصورت پل اسی مہمان خانے کے دروازے پر جا کر ختم ہوتا تھا۔ بڑے دروازے کے اندر ایک کھلا صحن تھا۔ جس کے دونوں پہلوؤں پر لمبے لمبے برآمدے تھے۔ اور ان کے پیچھے کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ کوٹھڑیاں تعداد میں کل چوبیس تھیں۔ یعنی بارہ ایک پہلو پر اور بارہ دوسرے پہلو پر۔ اور دونوں پہلوؤں پر چھ چھ کوٹھڑیوں کے درمیان ایک ایک بڑا کمرہ تھا۔ یہ دونوں کمرے مقفّل تھے۔ مہمان خانے کے اختتام پر پھر ایک بڑا دروازہ تھا۔ اُس کے آگے ایک بہت وسیع احاطہ۔ جس کے چاروں طرف بڑی بڑی کوٹھریاں تھیں۔ یہ شاہی اصطبل تھا۔ اس احاطہ میں زدن کے درخت لگے ہوئے تھے۔ جو فی الحقیقت رات کو روشنی دیتے تھے۔ اس مہمان خانے کی ایک کوٹھڑی میں ہم لوگ رہنے لگے۔

میں اکثر مولوی عبدالصمد سے ملنے جایا کرتا تھا۔ ایک دن دورانِ گفتگو میں عبدالصمد سے میں نے بھوتوں کی روایت کے متعلق دریافت

کیا۔ وہ کہنے لگا کہ بھوتوں کے متعلق سب روایات سچی ہیں۔ انہیں بھوتوں کی وجہ سے سردار اصلی گاؤں چھوڑ کر یہاں آباد ہُوا ہے لیکن یہاں بھی قبرستان میں رات کے وقت بھوت پھرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے خود ایک دفعہ ایک بھُوت کو دیکھا تھا۔ یہ ہمدان خاں کے مقتول حامیوں میں سے ایک کا بھُوت تھا۔

اُس کی زبانی یہ بھی معلوم ہُوا۔ کہ سردار پر اُن مقتولوں کی ایسی لعنت پڑی ہے۔ کہ وہ اب تک بے اولاد ہے۔ اُس کی عورتیں چونکہ دوسرے ملکوں کی ہوتی ہیں۔ جن کو بردہ فروش سردار کے پاس فروخت کر جاتے ہیں۔ اس لئے وہ کچھ عرصے کے بعد محل سرا سے بھاگ جاتی ہیں۔ میں نے کہا۔ کیا سردار اس بدعت کی روک تھام کے لئے کوئی انتظام نہیں کر سکتا۔ وہ کہنے لگا وہ بھی ہرجائی ہے۔ اس کے پاس بردہ فروش ہمیشہ نئی نئی لڑکیاں لاتے رہتے ہیں۔ یہ باتیں سن کر میں بہت متعجب ہُوا۔ کیونکہ اس گاؤں کی ہر ایک بات انوکھی تھی۔

(۴)

شام کا پژمردہ وقت تھا۔ افسردہ ہوائیں موسمِ خزاں کی آمد کا پتہ دے رہی تھیں۔ پت جھڑ سے درخت بے رونق ہو رہے تھے۔

پہاڑوں کی اُودی اُودی چوٹیاں سر پُرغرور کو بصد شان و شوکت اٹھائے تماشائے لیل و نہار میں مصروف تھیں۔ سرمئی آسمان پر دور دراز تک سفید بگلوں کی قطاریں۔ گھونسلوں میں پرندوں کی سوکھی پھڑپھڑاہٹ جنگلی گِدھوں کی منحوس آواز ایک ہیجانی کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ خونخوار ندی کا پانی سیاہ ناگن کی طرح اپنی زبان خارا شگاف سے پتھروں کو چھیدتا تیزی سے رواں تھا۔ اِرد گرد کی فضا نہایت اُداس تھی۔

میں عبدالصمد کی ملاقات سے واپس آتے ہوئے موسم کے انقلاب سے بہت متاثر ہُوا۔ اور بد دلی سے قدم اٹھاتا ہُوا مہمان خانے کی طرف واپس جا رہا تھا۔ ارادہ تھا کہ سردار سے رخصت حاصل کر کے واپس چلا جاؤں۔ کیونکہ جاڑا بہت قریب آگیا تھا۔

جونہی میں نے پل پر قدم رکھا۔ میری نظر ایک لڑکی پہ پڑی۔ جو پل کے آخری سرے پر کھڑی تھی۔ میں جلدی جلدی پل کو عبور کر کے اس کے قریب پہنچا۔ تو میرا دل دھڑکنے لگا۔ کیوں کہ یہ لڑکی بالکل ذکیہؔ کی ہم شکل تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ یکایک بڑے دروازے سے دو آدمی نکلے۔ ایک آدمی جو بہ نسبت اپنے ساتھی کے اچھی پوشش میں تھا۔ کہنے لگا۔ "شمشاد تم یہاں کھڑی ہو۔ اور ہم تمہیں مہمان خانے میں تلاش کر رہے تھے۔ چلو سردی ہو رہی ہے۔ یہاں ٹھہرنا

اچھا نہیں"۔

شمشاد کے نام پر میں دوبارہ چونکا۔ اور اپنے خواب کو الہام تصور کرنے لگا۔ لڑکی چپ چاپ متوحش نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اور میں دیر تک دریائے حیرت میں ڈوبا ہُوا وہیں کھڑا رہا۔ جب اندر گیا۔ تو مہمان خانے میں خوب چہل پہل تھی۔ چراغ نے مجھے بتایا کہ کشمیری سوداگر سردار کے پاس لڑکیاں فروخت کرنے آیا ہے۔ میں تمام رات سوچتا رہا۔ کہ کس طریقے سے اس لڑکی کی مدد کی جاوے۔ مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔

دوسرے دن فرزانہ کی زبانی معلوم ہُوا۔ کہ ان لڑکیوں میں سے جو سوداگر لایا تھا۔ صرف تین لڑکیاں سردار نے اپنے لئے منتخب کی ہیں۔ جن میں ایک شمشاد بھی ہے۔ باقی ماندہ لڑکیاں گاؤں کے لوگوں نے خرید لی ہیں۔ تیسرے دن صبح کو سوداگر چلا گیا۔ اور تمام کوٹھڑیاں خالی ہو گئیں۔

گو میں بہت اداس تھا۔ مگر واپسی کا ارادہ ترک کر دیا۔ کیونکہ اُس الہامی خواب کے زیر اثر مجھے یقین ہو چکا تھا۔ کہ شمشاد کو ایک نہ ایک دن میری مدد کی ضرورت ہو گی۔ کچھ دن بعد سخت سردی پڑنے لگی۔ برف باری بھی شروع ہو گئی۔ ہر طرف برف کے انبار دکھائی دینے لگے

ندی کا پانی یخ بستہ ہو کر رہ گیا۔ میں اور چراغ جو اتنی سردی کے عادی نہ تھے۔ رات دن اندر پڑے رہتے۔

خدا خدا کر کے موسم بہار کا آغاز ہوا۔ ہواؤں میں طراوت اور خوشگواری پیدا ہونے لگی۔ بلند پہاڑ جو آج سے چند دن پہلے بگلا بنے ہوئے تھے۔ سفید نقاب اتار کر سیاہ دیوؤں کی صورت اختیار کرنے لگے برف آہستہ آہستہ پگھل رہی تھی۔ ندی نالوں کی گنگناہٹ اور پرندوں کے شیریں گیت کائنات میں نئی زندگی کا پتہ دینے لگے۔

ایک دن صبح کو جب چراغ نے دروازہ کھولا۔ فرزانہ سہمی ہوئی اندر آئی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ میں نے اس کے خوف و ہراس کی وجہ دریافت کی تو وہ کہنے لگی —"آج میں نے ایک گہری سازش کا پتہ لگایا ہے۔ جو آپ لوگوں کے خلاف ہو رہی ہے"۔ میں نے تعجب سے کہا "میرے خلاف سازش"؟ وہ کہنے لگی ہاں۔ سنئے آج رات کو جب کہ میں اپنی کوٹھڑی میں بے خبر سو رہی تھی۔ آہٹ پا کر بیدار ہوئی۔ میں نے دیکھا۔ کہ میرا شوہر باہر جا رہا ہے۔ چونکہ ہمارے گاؤں میں رات کے وقت کوئی آدمی گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ اس لئے یہ بات غیر معمولی تھی۔ میں نہ رہ سکی۔ اور دل کڑا کر کے دبے پاؤں اس کے تعاقب میں روانہ ہو گئی۔

وہ سیدھا سردار کے محل کی طرف گیا۔ اور پچھواڑے کی طرف چھوٹے سے دروازے پر اس نے ایک خاص قسم کی دستک دی۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔ اور وہ اندر چلا گیا۔ اندر زدن کی روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے سوراخوں سے دیکھنا شروع کیا۔ دروازہ کھولنے والا شخص سردار سلطان خاں تھا۔ وہ نہایت مضمحل دکھائی دیتا تھا۔ سردار کہہ رہا تھا۔ دونوں کا خاتمہ ہو جانا چاہئے۔ نبی خاں مُصر تھا۔ کہ ایک ہی دن دونوں کو ٹھکانا لگانا لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا کر دے گا۔ ان دونوں میں کم از کم مہینے کا وقفہ ضرور ہونا چاہئے۔ اس پر سردار نے کہا۔ "اچھا دو تین دن کے اندر ایک تو ٹھکانے لگا دو"۔ نبی خاں کہنے لگا۔ یہ بھی اتنی جلدی نہیں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ندی میں ابھی پانی بہت تھوڑا ہے۔ تقریباً دس پندرہ دن تک زور پکڑے گا۔ سردار مضطرب ہو کر کہنے لگا "دن تو بہت ہیں۔ لیکن خیر، مجبوری ہے۔ اچھا تم اُس کل کو درست کر رکھو"۔ نبی خاں نے بہت بہتر کہا۔ اور سلام کر کے رخصت ہوا۔ میں اُس سے پہلے آ کر جھوٹ موٹ خراٹے لگانے لگی۔

فرزانہ کی باتوں سے صداقت کی بُو آتی تھی۔ لیکن بار بار مجھے خیال آتا۔ کہ ہمیں ٹھکانے لگانے میں سردار کا کیا فائدہ ہے۔ اس بات کو تقریباً ایک ہفتہ گذرا تھا۔ جمعہ کی نماز کے بعد سردار نے

مجھے حکم دیا۔ کہ مہمان خانے کی مرمت ہونی والی ہے۔ اس لئے اپنی کوٹھڑی خالی کرکے پل کی دوسری طرف اس خوب صورت جھونپڑے میں چلے جائیں۔ جو انہی دنوں تمہارے لئے بنوایا گیا ہے۔ اس حکم سے ہمارے شبہات اور بھی مضبوط ہو گئے۔ مگر ہمیں مجبوراً مہمان خانہ خالی کرکے اس جھونپڑے میں جانا پڑا۔

اب ہم لوگ فرزانہ کی رائے کے مطابق دن بھر تو اسی جگہ رہتے۔ لیکن رات کو ایک محفوظ جگہ چلے جاتے۔ یہ ایک جھونپڑی تھی جو گاؤں سے پرے ویران جنگل میں خوفناک درے کے قریب واقع تھی۔ یہ جھونپڑی اسی رشی کی تھی۔ جس نے فرزانہ کو بشارت دی تھی۔ کہ تیرا بیٹا ایک دن گاؤں کا سردار ہوگا۔

رشی کی موت کو کئی سال گذر چکے تھے۔ تاہم جھونپڑی اچھی حالت میں تھی۔ فرزانہ کا معمول تھا کہ وہ ہر روز صبح کے وقت جاکر جھونپڑی کو صاف کرتی۔ اور جہاں رشی بیٹھا کرتا تھا۔ اس جگہ کو پھولوں سے سجاتی۔ پھر دروازہ مقفل کرکے واپس آجاتی۔

اسی طرح ہمیں چھ دن گذر گئے۔ ایک دن صبح کے وقت میں نے یہ خبر سنی کہ ان لڑکیوں میں سے جو بردہ فروش لائے تھے۔ ایک لڑکی تاج نامی سردار کے محل سے بھاگ گئی ہے۔ سردار نے اس کی

تلاش میں مختلف راستوں پر سوار دوڑائے۔ پھر بھی اس لڑکی کا کچھ پتہ نہ ملا۔ آخر دوسرے دن باکھری سے دو کوس پرے ندی کے بہاؤ پر پانی میں سے کسی شخص کو ایک حاملہ عورت کی لاش ملی۔ جس کی کھال پتھر دل کی رگڑ سے اُدھڑ چکی تھی۔ شناخت ہونے پر معلوم ہوا۔ کہ لاش تاج کی ہے۔

اس لڑکی کی دردناک موت پر دفعتہً میرے دماغ میں روشنی پیدا ہوئی مجھے یقین ہو گیا۔ کہ وہ سازش جو سردار اور نبی خاں کر رہے تھے ناحق ہم نے اپنے سے منسوب کی۔ وہ اس کی مظلوم عورتوں کے خلاف تھی۔ کیونکہ نبی خاں کی گفتگو سے ظاہر تھا۔ کہ وہ کسی ندی میں پھینک کر ہلاک کرنا چاہتے ہیں............ میں نے فرزانہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ وہ کہنے لگی " یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سردار کی تمام عمر میں صرف یہی دو عورتیں بارور ہوئی تھیں۔ یعنی ایک تاج اور دوسری شمشاد۔ سردار کی تمام امیدیں انہیں سے وابستہ تھیں۔ اس صورت میں وہ تاج کو کیسے نقصان پہنچا سکتا تھا "

فرزانہ کے منہ سے شمشاد کے حاملہ ہونے کا سُن کر میں چونک اٹھا میں نے چلا کر کہا " فرزانہ ضرور اب دوسری موت شمشاد کی واقع ہوگی " فرزانہ کہنے لگی وجہ؟ میں نے کہا وجہ یہی ہے کہ وہ حاملہ ہے

وہ ظالم ہمیشہ اپنی مظلوم عورتوں کو جو حاملہ ہوتی ہیں ہلاک کر کے مشہور کر دیتا ہے۔ کہ وہ بھاگ گئیں۔ حالانکہ ان راستوں سے ایک عورت کا اکیلے فرار ہونا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ فرزانہ نے کہا آگے جو عورتیں غائب ہوتی رہیں وہ حاملہ نہ تھیں۔" میں نے کہا تمہیں کیا معلوم۔ وہ ان کو ابتدائی ایام ہی میں ہلاک کروا دیتا ہو گا۔ اب چونکہ حالات موسم سرما میں رونما ہوئے ہیں۔ جس وقت کہ ندی کا پانی منجمد تھا۔ اس لئے اس کام کو جلدی انجام نہ دے سکا۔ اور حمل ظاہر ہو گیا۔

میرے سمجھانے سے فرزانہ بھی قائل ہو گئی اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ ضرور شمشاد کو بچانے کی کوئی تدبیر کرے گی۔ وہ آج کل اپنے شوہر سے روٹھ کر آئی ہوئی تھی۔ اور ہمارے پاس ہی رہتی تھی۔

دوسرے دن صبح سویرے وہ باہر نکل گئی اور تمام دن غائب رہی۔ رات کو جب ہم سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ واپس آئی۔ اس کے چہرے پر فاتحانہ تبسم تھا۔ میں نے کہا کہو فرزانہ سارا دن کہاں رہی؟

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور لمبے لمبے کرتے کی آستین سے کسی پودے کے بیج نکال کر میرے سامنے رکھ دیئے۔ میں نے کہا "یہ کیا چیز ہے؟" وہ کہنے لگی یہ ایک قسم کا زہر ہے۔ جس کے کھانے

ہے آدمی تین دن تک مردہ رہتا ہے۔ یہ ہیں شمشاد کے لئے لائی ہوں۔ اس کے ذریعے اُس کو مردہ بنایا جائے گا۔ اور بعد میں اُسے بھوتوں کے آنے سے پیشتر قبر سے نکال کر آپ راتوں رات فرار ہو سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تجویز تو بہت اچھی ہے۔ مگر اُس پر یا اُس کے بچے پر کہیں مضر اثر نہ پڑے۔" فرزانہ کہنے لگی۔ "یہ بالکل بے ضرر چیز ہے۔ اگر اس کو کوئی نقصان پہنچا تو میں ذمہ دار ہوں۔"

(۵)

دوسرے دن ان بیجوں کو پیس کر سفوف بنایا گیا۔ اور ایک پڑیا میں باندھ کر فرزانہ نے اپنے پاس رکھ لیا۔ اور کہنے لگی۔ کہ محلسرا میں میری ایک رشتہ دار لڑکی ملازم ہے۔ آج میں اُس کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کروں گی۔"

وہ محلسرا کی طرف چلی گئی۔ شام کے بعد جب واپس آئی۔ تو کچھ گھبرائی ہوئی سی تھی۔ آتے ہی کہنے لگی "آقا دوا میں نے شمشاد کو پلوا دی ہے۔ اور یہ کام تو ہمارے حسب منشا ہو جائے گا۔ مگر اس کام میں عجلت کر کے میں نے بڑی غلطی کی۔ کیونکہ ہمیں اس سے قبل اس کے لئے کوئی محفوظ جگہ تلاش کر لینی چاہئے تھی۔ جہاں اُس کو بھوتوں کے

آنے سے پیشتر قبر سے نکال کر لے جاتے۔

میں نے کہا۔ اب بھی کافی وقت ہے۔ ابھی جا کر انتظام کریں گے

فرزانہ کہنے لگی "کیا اس وقت قبرستان جانے کا ارادہ ہے"

میں نے کہا "ہاں اس وقت کیا ڈر ہے؟" فرزانہ کہنے لگی "وہاں پہنچنے میں ہمیں بہت دیر ہو جائے گی۔ اور بھوتوں سے بچ کر ہم واپس نہیں آسکیں گے۔ آج گاؤں میں ایک عورت مر گئی تھی۔ اُس کی لاش پر بے شمار بھوت جمع ہو رہے ہونگے"

میں چونکہ بھوت پلید کا معتقد نہ تھا۔ اور اُن لوگوں کی روایات کی کوئی حقیقت نہ سمجھتا تھا۔ میں نے بے پروائی سے کہا "میں دیکھوں گا اُن بھوتوں کی کیا اصلیت ہے۔ درحقیقت یہ کوئی بندر کی قسم کا جانور ہوگا۔ جو میری بندوق کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا"

میں نے بندوق کندھے پر رکھی۔ اور زدن کی لکڑی جیب میں ڈال کر اکیلا چل کھڑا ہوا۔ مجھے اس طرح جاتے دیکھ کر چراغ بھی چپ چاپ میرے ساتھ ہو لیا۔ جب ہم گاؤں والے پل پر پہنچے تو فرزانہ بھی ہانپتی کانپتی ہم سے آملی۔ ہم لوگ خاموشی سے گاؤں کے باہر مولوی عبدالصمد کے مکان کی طرف جا کر ایک گھاٹی پر سے گذرتے ہوئے قبرستان میں جا داخل ہوئے۔

چاند کی چھٹی تاریخ تھی۔ وہاں درخت اس کثرت سے اُگے تھے کہ اُن کے سائے سے قبرستان بے حد تاریک ہو رہا تھا۔ آسمان ابر آلود تھا۔ چاند کبھی کبھی بادلوں سے نمودار ہوتا۔ اور گھنے درختوں کی شاخوں میں سے اُس کی دھیمی روشنی قبروں پر پڑ کر نہایت بھیانک سماں پیش کرتی۔

قبرستان کے ایک کونے میں جہاں درخت قدرے کم گھنے تھے۔ ایک احاطہ بنا ہوا تھا۔ جس میں ایک پہلو پہ دو کوٹھڑیاں تھیں فرزانہ نے مجھے بتایا کہ وہ شاہی قبرستان ہے۔ ہم لوگ اس احاطے میں داخل ہوئے۔ کوٹھڑیاں کھول کر دیکھیں۔ ایک کوٹھڑی میں قبر کھودنے کے اوزار اور لکڑی کے خالی تابوت رکھے تھے۔ دوسری کوٹھڑی میں ایک ایسی چارپائی پڑی تھی جس پہ میت رکھی جاتی ہے .... یہ چارپائی والی کوٹھڑی ہمارے کام کے لئے بہت موزوں تھی۔ اُسے فرزانہ نے صاف کیا۔ اور فیصلہ یہ ہوا کہ کل شمشاد کو رات بھر یہیں رکھا جائیگا صبح کے قریب اشی کی جھونپڑی میں لے جائیں گے۔ اس تجویز کو مکمل کر کے ہم لوگ احاطے سے نکلے۔ جب ہم اُس نئی قبر کے قریب پہنچے (جس میں آج نئی میت دفن کی گئی تھی) تو فرزانہ میرا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کی طرف کھینچنے لگی۔ میں نے کہا "یہ کیا کر رہی ہو؟" وہ سرگوشی سے کہنے لگی "دیکھو اس

نئی قبر کے پاس کیا چیز ہے " یک لخت بادل پھٹ گیا۔ اور چاند کی پھیکی بے رونق روشنی شاخوں سے چھن کر قبر پر پڑی۔ میں نے دیکھا کہ چار پانچ عجیب ساخت کے آدمی قبر کو پنجوں سے کھود رہے ہیں۔ شاید ان لوگوں نے میری آواز سن لی۔ یا چاند کی روشنی میں ہمیں دیکھ لیا۔ اُن میں سے ایک اپنا کام چھوڑ کر ہماری طرف بڑھنے لگا۔

میں نے ایک ہاتھ میں بندوق سنبھالی۔ اور دوسرے ہاتھ میں زون کی لکڑی پکڑ کر اُسے دیکھا۔ اُف میرے سامنے پانچ گز کے فاصلے پر ایک لاش جس کی آنکھیں بے نور اور ڈراؤنی تھیں۔ جس کے سر کے بال کھڑے تھے۔ جس کے دانت ہڈیوں کی طرح باہر نکلے ہوئے تھے اور جسم لکڑی کی طرح اکڑا ہوا تھا۔ اپنے استخوانی پنجے پھیلائے ہماری طرف آرہی تھی۔

میں فطرتاً دلیر واقع ہوا ہوں مگر یہ ہولناک منظر دیکھ کر میرے ہوش اُڑ گئے۔ زون کی لکڑی میرے ہاتھ سے گر گئی۔ عین اس وقت فرزانہ کا ہاتھ اونچا ہوا۔ اُس نے کوئی چیز اس لاش کی طرف زور سے پھینکی۔ فوراً ہمارے اور اس کے درمیان سیاہ دھند چھا گئی۔

فرزانہ ہم دونوں کو گھسیٹتی ہوئی احاطے کی طرف لے گئی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ہم لوگ اس کے اشارے پر اندھا دھند دوڑتے

ہوئے احاطے میں داخل ہوئے اور چارپائی والی کوٹھڑی میں پہنچ کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ چراغ نیم بے ہوش سا ہو رہا تھا۔ میری حالت بھی بہت بُری تھی۔ مگر فرزانہ کی طبیعت بالکل برقرار تھی.......

......تمام رات ہم نے دم سادھ کر اُس کوٹھڑی میں گذاری۔ اور صبح کی روشنی نمودار ہونے پر لرزتے ہوئے وہاں سے نکلے۔ اور سہمے سہمے ہوئے اس نئی قبر کو دیکھنے کے لئے بڑھے۔ قبر درمیان سے شق تھی۔ اِرد گرد گیلی مٹی کے تودے لگے تھے۔ اور لاش غائب تھی۔ خوف و ہراس سے پہلے ہی ہماری زبانیں گنگ ہو رہی تھیں۔ اب قبر کی حالت دیکھ کر رہے سہے حواس بھی گم ہو گئے۔

قبر اژدہا کی طرح منہ کھولے ہوئے تھی۔ اور بھوتوں کے پاؤں کے نشان نمناک زمین پر صاف نظر آتے تھے۔ ہم لوگ لڑکھڑاتے ہوئے قبرستان کی یاس آمیز بھیانک فضا سے نکل کر گھاٹی پر چڑھے۔ اور بہت بُری حالت میں گھر لوٹ آئے۔ راستے میں ہم نے ایک آدمی سے سنا کہ سردار کی رانی شمشاد آج رات فوت ہو گئی ہے۔

جھونپڑی میں آتے ہی میں اور چراغ بیدم ہو کر گر پڑے۔ فرزانہ بھی گو سہمی ہوئی تھی لیکن ہماری طرح دہشت زدہ نہ تھی۔ وہ قہوہ تیار کر کے لائی۔ اور مجھے تسلی دینے لگی۔ میں نے فرزانہ سے پوچھا۔ کہ

ہم لوگ رات کو اس بھوت سے کیسے بچے" وہ کہنے لگی " ہمارے ملک میں ایک قسم کی گھاس پیدا ہوتی ہے جس کے بھگونے سے دھند چھا جاتی ہے۔ ہمارے گاؤں کے لوگ اس گھاس کو ہمیشہ اپنے پاس رکھتے ہیں۔ چنانچہ جب میں رات کو آپ کے ساتھ گئی۔ تو گھاس میرے پاس موجود تھی۔ پھر میں نے آپ کی دواؤں کے بکس سے ایک بوتل لی اور اس میں پانی بھر کر ساتھ رکھ لیا۔

رات بھر میں خوف کی وجہ سے سو نہ سکا تھا۔ صبح کے قریب نیند آ گئی۔ اور دوپہر ڈھلے آنکھ کھلی۔ اب میری طبیعت درست تھی چراغ بھی کافی دیر سو چکا تھا۔ اور مطمئن معلوم ہوتا تھا۔

فرزانہ نے مکی کی موٹی موٹی روٹیاں اور گھی لا کر ہمارے آگے رکھا۔ ہم نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ اور رات کی مہم کے لئے تیار ہو گئے فرزانہ نے پتہ لگا لیا تھا۔ کہ شمشاد کو دفنا دیا گیا ہے۔

(۶)

شام قریب تھی۔ آفتاب کا چراغِ ہستی عنقریب گل ہونے والا تھا درختوں کے سائے غیر معمولی لمبے ہو کر سورج کی زرد اور مرجھائی ہوئی کرنوں میں متحرک تھے۔ پہاڑ غولِ بیابانی کی طرح کھڑے تھے۔ رات کی

آمد کے ساتھ ہی ہمارے حوصلے بھی پست ہوتے جارہے تھے۔ مگر کوئی پُراسرار طاقت ہمیں قبرستان کی طرف کھینچ رہی تھی۔

جب ہم لوگ شاہی قبرستان کے احاطہ میں داخل ہوئے۔ تو سورج کی آخری ٹمٹماتی ہوئی کرن بھی غائب ہوگئی۔ اور اُفق پر تاریک بادل چھاگئے فرزانہ کہنے لگی۔ یہ بادل ہمارے لئے بہت مفید ہیں۔ ہمیں ابھی سے اپنا کام شروع کردینا چاہیئے۔ تاکہ شام تاریک ہونے سے پہلے ہی شمشاد کو نکال لیا جائے۔

ہم تینوں کدالیں لے کر قبر کھودنے میں مصروف ہوگئے۔ آدھ گھنٹہ میں ہم نے شمشاد کو تابوت سے نکال لیا۔ فرزانہ کہنے لگی خلاف امید یہ کام بہت جلد ہوگیا ہے۔ اس لئے میں چاہتی ہوں۔ کہ شمشاد کو اسی وقت رشی کی جھونپڑی میں پہنچا دیا جائے۔ یہ کوٹھڑی زیادہ محفوظ نہیں مبادا بھوت نیا گل کھلائیں۔

فرزانہ کا مشورہ معقول تھا۔ چنانچہ میں نے شمشاد کو کندھے پر اُٹھالیا اور گھاٹی کو عبور کرکے جنگل کی طرف بڑھے۔ ایک گھنٹہ تک ہم اس جھونپڑی میں پہنچ گئے۔ ابھی ہم اندر داخل ہوئے ہی تھے۔ کہ رم جھم مینہ برسنا شروع ہوا۔ ہم نے دروازہ ایک آہنی کھٹکے کے ساتھ اندر سے بند کرلیا۔ اور شمشاد کو گھاس کے بستر پر لٹا دیا گیا۔ میں اپنے کپڑوں

کا ایک جوڑا ساتھ لایا تھا۔ فرزانہ نے کفن اتار کر اُسے میرے کپڑے پہنا دیئے۔ ہم لوگ اپنی کامیابی پر مسرور تمام رات جاگتے رہے۔

صبح کو فرزانہ کہنے لگی "تم اپنی جائے اقامت پر واپس چلے جاؤ۔ میں یہاں شمشاد کے پاس رہوں گی۔ تم رات کو میرے لئے کھانا لے کر آجانا۔

بادل کھل کر آسمان صاف ہو چکا تھا۔ ہم گھر کی طرف روانہ ہوئے فرزانہ کچھ دور تک ہمارے ساتھ آئی۔ ہم جھونپڑی سے تقریباً تیس گز کے فاصلے پر آئے ہوں گے۔ کہ وہ فوراً رُک گئی۔ اور حیرت سے زمین کی طرف دیکھنے لگی۔ اس جگہ مٹی بہت چکنی اور نرم تھی۔ اس پر بہت سے بے ڈھنگے پاؤں کے نشانات تھے۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ کسی لاش کے قدموں کے نشان تھے۔ ہم خوف زدہ ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ فرزانہ کہنے لگی "ضرور کفن کی بُو پر بھوت ادھر آئے ہیں۔ مگر بارش کی وجہ سے جھونپڑی کو دیکھ نہیں سکے۔" میں نے مضطرب ہو کر کہا "اب کیا کیا جائے؟"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اور کچھ دیر بعد کہنے لگی۔ اُن اونچے پہاڑوں میں مجھے ایک غار معلوم ہے۔ یہ غار بہت بڑا اور محفوظ ہے۔ اس میں داخل ہو کر اگر اس کے چھوٹے سے دہانے پر پتھر چن دیئے جائیں تو

باہر سے کوئی ان کو ہٹا نہیں سکتا۔ اس لئے آج شمشاد کو سرِ شام ہی وہاں پہنچا دیا جائے تو بہتر ہو گا۔

میں نے دریافت کیا۔ وہ غار یہاں سے کتنی دور ہے۔ وہ کہنے لگی۔ یہاں سے کوئی کوس بھر کے فاصلے پر ہو گا۔ اگر آپ چاہیں تو ابھی چل کر دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے کہا" ضرور" وہ دوڑتی ہوئی گئی اور جھونپڑی کا دروازہ مقفل کر کے ہمارے آگے آگے چل دی۔ جنگل کے کناروں پر گھومتے ہوئے ہم لوگ پہاڑ کے دامن میں پہنچے۔ یہ زمین سنگلاخ اور راستہ ناہموار تھا۔ مگر طوعاً کرہاً اس غار تک جا ہی پہنچے۔

واقعی یہ غار محفوظ۔ اندر سے وسیع اور صاف ستھرہ تھا۔ ایک طرف بڑی بڑی سلیں تھیں۔ جو غار کا منہ بند کرنے کے لئے بہت موزوں تھیں۔ غار اندر سے اس قدر لمبا تھا۔ کہ اس کا دوسرا سرا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے کہا" فرزانہ یہ غار کہاں ختم ہوتا ہے؟" فرزانہ نے لاعلمی ظاہر کی۔ اس لئے میں اور چراغ زون کی لکڑی ہاتھ میں پکڑے غار کا معائنہ کرنے لگے۔

تقریباً دو فرلانگ چلنے کے بعد راستہ اتنا نیچا ہو گیا۔ کہ ہمیں جھک کر چلنا پڑا۔ ہمارے سامنے کسی زمین دوز آبشار کے گرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ ہماری پنڈلیوں تک پانی آپہونچا تھا۔ آگے پانی کے گہرا

ہونیکا خطرہ تھا۔ تاہم ہمیں اطمینان ہو گیا۔ کہ اس طرف سے کسی قسم کا خطرہ نہیں اور ہم واپس آ گئے فرزانہ تو شمشاد کے پاس چلی گئی۔ اور ہم دونوں اپنی جھونپڑی میں آ گئے۔

گھر پہنچ کر میں نے غسل کیا۔ اور کپڑے تبدیل کر کے سردار کے پاس جھوٹی تعزیت کو گیا۔ دوپہر کے قریب وہاں سے واپس آیا۔ اور کھانا کھا کر سو گیا۔ چار بجے کے قریب بیدار ہوا۔ ساتھ لے جانے کا ضروری سامان فراہم کر کے میں اور چراغ وقت کا انتظار کرنے لگے خدا خدا کر کے دن ختم ہوا۔ سورج گوشۂ مغرب میں روپوش ہونے والا تھا۔ کہ ہم لوگ اس طرف چل کھڑے ہوئے۔ شام کے پہلے ستارے نے جب آسمان کی کھڑکی سے جھانکا۔ تو ہم جھونپڑی تک پہنچ چکے تھے

فرزانہ نے سامان خورد و نوش سنبھالا۔ میں اور چراغ باری باری شمشاد کو کندھے پہ اٹھاتے غار کی طرف روانہ ہوئے۔ اور نہایت پھرتی سے راستہ طے کر کے منزل مقصود تک جا پہنچے۔

غار بہت تاریک ہو رہا تھا۔ جس کو زون کی بہت سی ٹہنیوں سے روشن کرنا پڑا۔ پھر دہانے کو سِلوں سے بند کر کے ہم نے بہ اطمینان خاطر کھانا کھایا۔ اس کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ہم تینوں رات کو باری باری جاگ کر شمشاد کی حفاظت کریں۔ پہلے تین گھنٹے چونکہ چراغ کی باری تھی۔ میں اور فرزانہ بے فکر سو گئے۔

ہمیں سوئے کوئی ایک گھنٹہ گزرا ہوگا۔ کہ یک لخت ایک جگر خراش چیخ سنائی دی۔ میں اور فرزانہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھے۔ تو چراغ بے ہوش پڑا تھا۔ ہمیں خیال ہوا شاید اسے سانپ نے کاٹ لیا ہے میں اسے دیکھنے کے لیئے جھکا ہی تھا۔ کہ فرزانہ بھی اُلو کی طرح چیخنے لگی۔ میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

اس کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ لب خشک ہو رہے تھے اور لرزہ براندام غار کے اندرونی حصّے کی طرف اشارہ کر کے بے تحاشا چیخ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

آہ معبود! ایسا جگر پاش اور حوصلہ شکن نظارہ میرے پیشِ نظر تھا۔ کہ خوف سے مجھ پر بجلی سی گر گئی۔ انتہائی دہشت سے میرے ہاتھ پاؤں مفلوج ہو کر رہ گئے۔ اور گلا خشک ہو کر بند ہو گیا۔ میں نے دیکھا۔ کہ چار پانچ انسانی لاشیں جن کی شکلیں مسخ شدہ اور بے حد ڈراؤنی تھیں۔ غار کے اندرونی حصّے سے نکل کر ہماری طرف آ رہی ہیں۔

فرزانہ کی چیخیں اب بند ہو چکی تھیں۔ وہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ میں اس بدحواسی میں اٹھا۔ مرتعش ہاتھوں سے بندوق اٹھائی اور ایک لاش کی پیشانی کا نشانہ باندھ کر داغدی۔ گولی ٹھیک نشانہ پر بیٹھی۔ اس لاش کا آدھا سر اڑ گیا۔ مگر وہ بدستور بڑھ رہی تھی۔ حتیٰ کہ

لاشیں بالکل قریب آگئیں۔

بڑھی ہوئی مایوسی اور بے بسی سے میرا دل بیٹھ رہا تھا۔ میں دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہوا۔ کہ کوئی ٹھنڈی سخت چیز میرے بدن سے مس ہوئی۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

(۷)

جب میری آنکھ کھلی۔ تو میں اور چراغ ایک بڑے وسیع ہال میں پہلو بہ پہلو ایک چٹائی پر پڑے تھے۔ چراغ کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے۔ اور وہ ابھی غشی کی حالت میں تھا۔ کمرے میں زرد رنگ کی روشنی ہو رہی تھی۔ ایک طرف بڑے سے گول دائرہ کی صورت میں دھیمی دھیمی آگ جل رہی تھی۔ اس دائرے کے درمیان ایک پلنگ بچھا تھا جس پر ایک لڑکے کی لاش پڑی تھی۔ یہ لاش بالکل تازہ معلوم ہوتی تھی۔ لاش کے قریب ایک سفید ریش بوڑھا آدمی اس کی طرف ٹکٹکی باندھے کھڑا تھا اس لاش کو دیکھ کر مجھے وہ غار والا منظر یاد آگیا۔ میرے جسم میں جھرجھری سی ہوئی اور ایک کپکپاتی ہوئی چیخ نما آہ میرے منہ سے نکل گئی۔

میری آواز پر وہ بوڑھا پلٹا۔ اور آگ کا دائرہ پھاند کر میرے قریب

اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بے سوچے سمجھے چیخ کر کہا "اے شاہِ جنات! ہم پہ رحم کر" بوڑھا نرمی سے کہنے لگا "خوف نہ کرو۔ میں تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔ تم بالکل محفوظ جگہ پہ ہو"

اس کے بعد اس آدمی نے دوسرے کمرے سے ایک پیالہ دودھ کا لاکر مجھے دیا۔ جس کے پینے سے میرے بدن میں کچھ توانائی آگئی اور میں اُٹھ کر ستون کے سہارے بیٹھ گیا۔ وہ بوڑھا میرے قریب بیٹھ کر کہنے لگا "میاں مشتاق" میں اس کی زبانی اپنا نام سُن کر سناٹے میں آگیا۔ مگر وہ کہنے لگا "حیرانی کی کوئی وجہ نہیں۔ فرزانہ کی زبانی تمہارا نام اور وہ سب قصہ جس کی وجہ سے تم مصیبتوں میں مبتلا ہوئے۔ سُن چکا ہوں" پھر آہ سرد بھر کر کہنے لگا " میں سردار سلطان خاں کا بدقسمت چچا ہوں۔ میرا نام نعمان خاں ہے۔ اور یہ جگہ باٹھری کا قدیم گاؤں ہے جہاں تم اس وقت بیٹھے ہو یہ باٹھری کا قلعہ ہے آج سے پچاس سال پیشتر میں یہاں کا حاکم تھا۔ مجھے شکار کا بے حد شوق تھا۔ ایک دفعہ شکار کے موقعہ پر جب میں گھوڑے پہ سوار تھا ایک کھڈ کے کنارے پہ سے گذر رہا تھا۔ تو ایک ملازم نے مجھے دھکا دے کر کھڈ میں پھینک دیا۔ کئی دن بعد جب میں ہوش میں آیا۔ تو اپنے آپ کو ایک سادھو کی کُٹیا میں پایا۔ کچھ عرصہ تک میں اسی کُٹیا میں

صاحب فراش رہا۔ سادھو نے میری بہت خدمت کی۔ اور اس کی کوششوں سے میری جان بچ گئی۔

جب میں بالکل تندرست ہو گیا۔ تو اس سادھو کے ذریعے معلوم ہوا کہ میری جگہ اب میرا چھوٹا بھائی رمضان خاں (میرے لڑکے ہمدان خاں کے زمانہ نابالغی تک) یہاں حاکم قرار پایا ہے۔ اور میری بابت گاؤں میں یہ مشہور کر دیا گیا ہے۔ کہ نعمان خاں کی روح بھوت بن گئی ہے کیونکہ میری لاش نہ ملنے سے میرے بھائی کو میری طرف سے اندیشہ تھا مجھے بھائی کی شقاوت قلبی سے سخت صدمہ ہوا۔ مجھے اس سے بہت محبت تھی۔ لیکن اس کا یہ سلوک دیکھ کر میرا دل ٹوٹ گیا۔ اور میں حکومت کا خیال ترک کر کے اس سادھو کے پاس رہنے لگا۔ یہ سادھو ایک زبردست عامل تھا۔ اس کے علاوہ اسے علمِ طب میں بھی کمال حاصل تھا۔ اس کی ہم نشینی میں مجھے بھی اس کے علوم و فنون کی خواہش پیدا ہوئی۔ اور اس کی شاگردی میں رہ کر چند سال کے عرصے تک میں بھی زبردست عامل بن گیا۔ میری ظاہری موت سے تیرہ سال بعد میرے بھائی رمضان خاں کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت میرے لڑکے ہمدان خاں کی عمر چودہ سال کی تھی۔ اور رمضان خان کا لڑکا بیس سال کا تھا۔ یہ لڑکا اپنے باپ سے بھی زیادہ سنگدل ثابت ہوا۔ اس نے ہمدان خاں کو زہر

دے دیا۔ اور اس کے حامیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اس خبر سے دنیا میری نظروں میں اندھیر ہو گئی۔ میں چاہتا تو سلطان خاں سے سخت انتقام لیتا۔ مگر میں نے اُسے نقصان پہنچانا پسند نہ کیا۔

ان دنوں میں اور سادھو لاشوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش میں ان پر عمل کیا کرتے تھے۔ اس لئے میں اپنے لڑکے کی لاش کو بھی قبر سے نکال لایا۔ چنانچہ یہ لاش جو سامنے پلنگ پر پڑی ہے۔ اُسی لڑکے ہمدان خاں کی ہے۔ اور یہ چالیس سال کی پُرانی لاش اب تک تازہ معلوم ہوتی ہے۔

آخر کار کئی سال کی تگ و دو کے بعد ہمیں صرف اتنی قدرت حاصل ہوئی۔ کہ ہم لوگ مردہ لاشوں سے اپنی دماغی قوت کے ماتحت خدمت لینے لگے۔ یعنی جس کام کا ہم خیال کرتے۔ لاشیں فوراً ہمارے عمل کے زور سے وہ کام انجام دینے لگتیں۔ لیکن ہم چاہتے تھے۔ کہ لاشوں میں اصلی روحیں ڈال کر انہیں زندہ کیا جائے۔ اس لئے ہم نے اپنا عمل باقاعدہ جاری رکھا۔ اور جب کبھی کوئی گاؤں میں مر جاتا۔ تو ہم اپنے تخیل کے ذریعے ان خدمتگار لاشوں کو حکم دیتے۔ اور وہ مردے کو قبر سے نکال کر ہمارے پاس لے آتیں۔ ابتدا میں جن لاشوں کو ہم نے معمول بنایا۔ ان میں زیادہ تر ہمدان خاں کے حامیوں کی لاشیں تھیں

جب ان لاشوں کی تعداد بڑھ گئی۔ تو ان کی رہائش اور اپنے عمل کے لئے ہمیں کسی وسیع عمارت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس لئے غور و خوض کے بعد ہم دونوں نے یہ طے کیا۔ کہ ان لاشوں کو ایک گھنٹہ کے لئے باتھری کے گلی کوچوں میں کھلم کھلا پھرنے کا حکم دیا جائے۔ تاکہ وہ لوگ ڈر کر گاؤں خالی کر دیں۔ چنانچہ ان لاشوں کو ہم نے اپنی قوت متخیلہ کے ماتحت وہاں جانے کا حکم دیا۔ تو وہ بلا دھڑک گاؤں میں داخل ہو گئیں۔ جب گاؤں کے لوگوں نے ان لاشوں کو دیکھا۔ ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ کئی لوگ خوف سے مر گئے۔ اور کئی اپنے مکانوں میں چھپ گئے۔ سلطان خاں اتنا خوف زدہ ہوا کہ اپنی رعایا سمیت گاؤں خالی کر کے بھاگ گیا۔ اور ایک درّے کو جو یہاں سے قریب ہے عبور کر کے دوسری طرف نیا باتھری آباد کیا۔ اور درّے کو ایک نہایت بلند سنگی دیوار بنا کر بند کر دیا۔ اس طرح میں نے یہ قلعہ اور گاؤں اس سے جیت لیا۔ جب یہ لوگ یہاں سے ہجرت کر گئے۔ تو ہمیں اپنے عمل کے لئے نئی لاشوں کے حاصل کرنے میں بہت دقت ہونے لگی۔ لیکن بہت جلد ہم نے ایک ایسا راستہ تلاش کیا جو پایاب ندی کے زمین دوز منبع کے قریب سے ہوتا ہوا ایک وسیع غار میں کھلتا تھا۔ اور نئی باتھری کا قبرستان بھی اس جگہ سے صرف میل بھر کے فاصلے پر تھا۔ اب

ہمیں اپنے کام میں بہت سہولت ہو گئی۔ ہم لوگ اس خفیہ راستے ان لاشوں کو قبرستان میں بھیج دیتے۔ جو نئی قبر سے مردہ نکال کر لے آئیں۔ اب وہ سادھو مر چکا ہے۔ دنیا میں میری صرف یہی آرزو ہے۔ کہ انسان کی فرار شدہ روحیں دوبارہ تن خاکی میں داخل کرنے میں کامیابی حاصل کروں۔ تاکہ اپنی زندگی ختم ہونے سے پہلے ایک بار اپنے لڑکے کو زندہ دیکھ سکوں۔ گو مجھے اس لگاتار کوشش کے باوجود ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ مگر امید واثق ہے۔ کہ ایک دن میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ پرسوں یہ لاشیں ایک تابوت کھود کر لائیں۔ تابوت میں صرف شاہی خاندان کے لوگ ہی رکھے جاتے ہیں۔ اس لئے تابوت کو دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگا۔ لیکن جب تابوت کا ڈھکنا اٹھایا۔ تو تابوت خالی تھا۔ میں سوچنے لگا۔ لاش کہاں جا سکتی ہے۔ مجھے یہ معمہ حل کرنے کی جستجو ہوئی۔ اس لئے میں نے لاشوں کو حکم دیا۔ کہ اس تابوت کی آرامگاہ میں سونے والا جہاں کہیں ہو لے آؤ۔ اگر اس کام میں کوئی مزاحمت کرے تو اس کو بھی پکڑ لاؤ۔ چنانچہ جب تم لوگ غار میں پناہ گزیں تھے۔ تو یہ لاشیں شمشاد کی تلاش میں باتھری جانے کے لئے اس غار سے گذریں۔ اور شمشاد کے علاوہ تم لوگوں کو بھی جو بے ہوش تھے اٹھا لائیں۔ لیکن شمشاد نے

ان لاشوں کو نہیں دیکھا۔ اور نہ ان لاشوں کا اس کو کچھ علم ہے۔ وہ یہی سمجھتی ہے۔ کہ تم لوگ اسے یہاں لائے ہو۔ میں نے اس کو ایسے آرام دہ کمرے میں رکھا ہے۔ جہاں ان لاشوں کا گذر نہیں۔ وہ اس وقت ہوش میں ہے۔ اور بہت کمزور ہے۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ چراغ کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ ہوش میں آچکا تھا۔ مگر بے چینی سے سر کو ادھر ادھر پٹک رہا تھا مجھے دیکھ کر وہ اتنا خوف زدہ ہوا کہ اس کی آنکھیں حلقوں سے پھوٹ کر باہر نکلنے لگیں میں حیران تھا کہ کیا معاملہ ہے۔

یکایک اس نے میرے سر کی طرف اشارہ کیا۔ نعمان خان کہنے لگا۔ وہ تمہارے بالوں سے جو رات کو غار والا خوفناک سین دیکھنے سے بالکل سفید ہو چکے ڈر رہا ہے۔ میں نے اُسے تسلی دی۔ کہ ہم لوگ محفوظ ہیں۔ اور بتایا کہ خود اس کے بال بھی میری طرح سفید ہیں۔ جس کی وجہ رات والا انتہائی صدمہ ہے۔ اس کے بعد نعمان خاں سے اس کا تعارف کرایا۔ اور نعمان خاں والا قصہ بیان کر کے اُسے بھُوتوں کی اصلیت سے آگاہ کیا۔

نعمان خاں نے ہمیں اپنے قلعے کے ایک گوشہ میں نہایت آرام دہ کمرہ رہنے کو دیا۔ اس کمرے کے دروازے ہم نے اندر سے بند کر لئے

اور اطمینان سے سو گئے۔ سہ پہر کو دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا۔ تو نعمان خاں کھڑا تھا۔ وہ ہمیں شمشاد کے پاس لے گیا۔ فرزانہ نے اس کو ہماری خدمت گذاری سے آگاہ کر رکھا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اور دیر تک میرا شکریہ ادا کرتی رہی۔

(۸)

دوسرے دن نعمان خاں نے مجھے کہا۔ کہ تم لوگوں کی زبانی یہ سن کر کہ سلطان خاں اپنی حاملہ بیویوں کو نبی خاں کے ہاتھوں ہلاک کرا دیتا ہے۔ میں بہت متعجب ہوں .... نبی خاں کو میری خدمت گار لاشیں گرفتار کر کے لے آئی ہیں۔ اور میں اس کے بیان لینے والا ہوں۔ اگر تم چاہو تو میرے ساتھ چل سکتے ہو۔ میں نے کہا۔ کیا وہ لاشیں بھی وہیں ہونگی۔ نعمان خاں کہنے لگا۔ ہاں وہ تو ہر وقت وہیں رہتی ہیں۔ اس دن صرف تمہاری خاطر ان کو ہٹایا گیا تھا۔

ہم دونوں ان خوفناک لاشوں کے تصور سے گھبرا گئے۔ نعمان خاں ہمیں جز بز دیکھ کر کہنے لگا۔ اگر تم لاشوں سے خوف کھاتے ہو۔ تو تمہیں ایسی جگہ بٹھا سکتا ہوں جہاں سے تم سب کچھ دیکھ سکو۔ اور اس

کی باتیں سن سکو:

چنانچہ وہ ہمیں قلعہ کے اوپر ایک برج میں لے گیا۔ جس میں نیچے اُترنے کے لئے ایک تنگ زینہ بنا ہوا تھا۔ اس زینہ کے ذریعے ہم ایک گیلری میں اُتر گئے۔ یہ چھت کے ساتھ ملی ہوئی جالی دار گیلری اس بڑے ستون کے اردگرد بنائی گئی تھی۔ جو ہال کمرے کے درمیان ایستادہ تھا۔ نعمان خاں چلا گیا۔ اور ہم دونوں لکڑی کی ایک نشست پر بیٹھ کر دیکھنے لگے۔ ہال کمرہ اس وقت ہمارے قدموں کے نیچے تھا۔

نبی خاں اس ستون کے قریب ایک چٹائی پر بے ہوش پڑا تھا۔ اور لاشوں کی ایک جماعت سامنے والی دیوار کے ساتھ پشت لگائے کھڑی تھی۔ آگ کا دائرہ برابر جل رہا تھا۔ اتنے میں نعمان خاں ہال میں داخل ہوا۔ نبی خاں کو ابھی تک بیہوش پاکر اس نے کوئی دوا اس کے منہ میں ٹپکائی جس کے اثر سے فوراً وہ ہوش میں آگیا۔ اس نے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔ اور لاشوں کی جماعت دیکھ کر چیخیں مارنے لگا۔ نعمان خاں تحکمانہ لہجہ میں بولا۔ اس چیخ و پکار سے کوئی فائدہ نہیں۔ اگر جان کی امان چاہتے ہو۔ تو جو میں دریافت کروں سچ سچ بتا دو۔ نبی خاں ہکلا کر کہنے لگا۔ "آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

نعمان خاں نے کہا۔ میں نے سنا ہے کہ سلطان خاں اپنی عورتوں

کو جو حاملہ ہوتی ہیں۔ تمہارے ہاتھوں ہلاک کروا دیتا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟
نبی خاں کانپ کر کہنے لگا۔ ہاں بالکل صحیح ہے۔ نعمان خاں بولا۔ وہ ایسا ظالمانہ فعل کیوں کرتا ہے؟ نبی خاں نے جواب دیا۔ اس کو کسی نجومی نے کہا تھا۔ کہ تمہارے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا۔ جس کی پیدائش کے بعد تم جلدی مر جاؤ گے۔

اس غرض سے سردار نے کھنڈ کے اوپر ایک مہمان خانہ بنوا رکھا ہے۔ جس میں آمنے سامنے دو ہال کمرے ہیں۔ ان دو کمروں کے درمیان ایک زمین دوز خفیہ کمرہ کھنڈ کی خوفناک گہرائی پر بنایا گیا ہے۔ اس خفیہ کمرے میں ایک عجیب و غریب کل لگی ہوئی ہے۔ ان کمروں سے ایک تو قتل گاہ ہے۔ اور دوسرے میں اس کل والے کمرے میں جانے کا خفیہ راستہ ہے۔ جو انگیٹھی میں ایک کمانی دبانے سے کھلتا ہے۔
جو کمرہ قتل گاہ کا کام دیتا ہے۔ اس میں ایک مسہری ہے۔ یہ مسہری جو پتھر کی معلوم ہوتی ہے۔ دراصل لکڑی کے دو تختے ملا کر بنائی گئی ہے۔ اس پر شیر کی خوبصورت کھال اس صفائی سے منڈھی ہوئی ہے کہ بالکل دو حصوں کا نشان دکھائی نہیں دیتا۔ ان دو تختوں کے نیچے زنجیریں لٹک رہی ہیں۔ کل کا ہینڈل دبانے سے تختے جدا ہو جاتے ہیں۔ اور اس پر سونے والا تحت الثریٰ میں گر کر ہلاک ہو جاتا ہے۔

سردار جب اپنی کسی عورت کی جان لینے کا ارادہ کرتا ہے۔ تو اُسے آدھی رات کو پل کی سیر کے بہانے لے کر محل سرا کے پچھلے دروازے کے ذریعے مہمان خانے میں آجاتا ہے۔ یہاں وہ اس لڑکی کو ایک خاص قسم کی شراب پلاتا ہے۔ جس سے وہ گہری نیند سو جاتی ہے۔ اس کے بعد سردار اس کو مسہری پر لٹا کر الو کی طرح آواز نکالتا ہے۔ میں جو پہلے ہی اس کی آواز پر کان لگائے بیٹھا ہوتا ہوں۔ جھٹ مشین کا ہینڈل دبا کر اس لڑکی کو کھڈ میں گرا دیتا ہوں۔ اس طرح وہ فوراً ہلاک ہو کر پانی میں بہہ جاتی ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔

یہ باتیں سن کر غیظ و غضب سے نعمان خاں کا چہرہ سرخ ہو گیا اور کہنے لگا خدا کی قسم میں سلطان خاں کو قید کر کے اس ظلم کا خاتمہ کرونگا وہ ہرگز حکومت کے قابل نہیں۔

ایک دن نعمان خاں میرے پاس آیا اور کہنے لگا میں نے سلطان خاں کی گرفتاری کے لئے لاشوں کو بھیجا ہے مگر وہ ابھی تک ہاتھ نہیں آیا۔ کیونکہ بنی خاں کی گمشدگی سے خوف کھا کر گاؤں کے لوگوں نے جگہ جگہ الاؤ لگا رکھے ہیں۔ ایسی حالت میں ان لاشوں کے جل جانے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے ابھی کچھ دن انتظار کروں گا۔

(۹)

ہمیں اس غیر آباد قلعے میں آئے ڈیڑھ مہینہ ہو گیا۔ ایک دن صبح کو فرزانہ نے ہمیں شمشاد کے فرزند پیدا ہونے کی خوش خبری دی۔ ہم فوراً بچہ کو دیکھنے گئے۔ نعمان خاں پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ اور بچہ کو دیکھ کر نہال ہو رہا تھا۔ پرشکوہ پہاڑوں سے رونما ہونے والا آفتاب اپنی رنگین کرنوں سے اس کے چہرے کو شادمانی کی جلا دے رہا تھا۔ ویران گاؤں کے کھنڈروں میں رونق و برکت جھلک رہی تھی۔ کائنات کی ہر ایک چیز ہنستی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اور ہم سب کے دل مسرت سے بھرپور تھے۔

تھوڑی دیر بعد نعمان خاں چلا گیا۔ مگر ہم دونوں تمام دن وہیں رہے شمشاد بخار میں مبتلا تھی۔ میں اس کا علاج کرتا رہا۔ شام کے وقت میں فرزانہ کو ضروری ہدایات دے کر چراغ کے ہمراہ اپنی جائے قیام کی طرف روانہ ہوا۔

جب ہم صدر دروازے کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ لاشوں کی ایک پوری جماعت دروازے میں داخل ہو رہی ہے۔ ان میں سے دو لاشوں کے کندھوں پر ایک بڑا سا بنڈل تھا۔ ہم دونوں گھبرا کر

ایک طرف ہٹ گئے۔ اور وہ جماعت سیدھی ہال میں چلی گئی۔ میں نے چراغ سے کہا:۔ چلو گیلری سے جا کر دیکھیں۔ اس بنڈل میں کیا چیز ہے؟
چنانچہ ہم گیلری پر چڑھ گئے۔ آتشیں دائرہ بدستور جل رہا تھا۔ نعماں خاں اپنے لڑکے کی لاش پر عمل کرنے میں مصروف تھا۔ ستون کے قریب لاشوں نے اپنا بوجھ اُتارا۔ اور کپڑوں میں لپٹی ہوئی چیز کو کھول دیا یہ سردار سلطان خاں تھا۔ جس کو ان لاشوں نے چٹائی پر ڈال دیا۔ اور خود ساری جماعت سامنے والی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔

ہم انتظار میں تھے۔ کہ دیکھیں چچا بھتیجا کی ملاقات کس طرح ہوتی ہے اور اس ملاقات کا ان دونوں پر کیا اثر ہوتا ہے۔ لیکن نعمان خاں اپنے کام میں اس قدر منہمک تھا۔ کہ اسے اس کارروائی کا کچھ علم نہ ہوا۔ سلطان خاں کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ وہ ابھی تک غشی کی حالت میں تھا۔ لیکن کچھ دیر بعد جب اسے ہوش آیا۔ تو انگڑائی لے کر ستون کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے اس کی نظر اپنے چچا پر پڑی۔ جو اپنے لڑکے کی لاش کے پاس کھڑا اس پر عمل کر رہا تھا۔

وہ کچھ دیر تک اُسے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر کسی فوری جوش سے گھونسہ تان کر حملے کی نیت سے اٹھا۔ مگر جب اس کی نظر سامنے دیوار کے ساتھ کھڑی ہوئی لاشوں پر پڑی۔ تو لڑکھڑا کر گر پڑا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ اور

رنگ جو پہلے زرد تھا۔ نیلا ہو کر مرجھا گیا۔ اس کی گنہگار روح جسم سے علیحدہ ہو چکی تھی۔ نعمان خاں اب تک ان واقعات سے بے خبر اپنے عمل میں مصروف تھا۔

دفعتہً لڑکے کی لاش میں زندگی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ اور وہ یکایک آنکھیں کھول کر اُسے خشمناک نگاہوں سے گھورنے لگا۔ پھر وہ یکدم اٹھا۔ اور بھوکے شیر کی طرح اس پر جھپٹا۔ اور اپنی انگلیاں بوڑھے کے گلے میں پیوست کر دیں۔

یہ حالت دیکھ کر فوراً ایک خیال بجلی کی طرح میرے دماغ میں کوند گیا۔ میں نے اوپر سے چلّا کر کہا۔ آہ یہ فتح ایک مکمل شکست ہے تمہارے بیٹے کے جسم میں سلطان خاں کی رُوح داخل ہو گئی ہے۔ اس نے میری آواز سن لی اور پھٹی پھٹی ہوئی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا یکایک سلطان خاں کی لاش دیکھ کر سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آگیا۔

اب وہ گلا چھڑانے کی ناکام جدوجہد چھوڑ کر لاشوں کی جماعت کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ یہ نظریں بے معنی نہ تھیں۔ وہ ان کو دشمن پر ٹوٹ پڑنے کا حکم دے رہا تھا۔ یک لخت لاشیں آگ کا دائرہ پھاند کر چل پڑیں اور لڑکے کی لاش کی تکا بوٹی کر دی۔ لیکن اس کی انگلیاں بدستور بڈھے کے گلے میں جکڑی رہیں۔ اور وہ مردہ ہو کر فرش پہ گر گیا۔

نعمان خاں کے مرنے سے لاشوں کی قوت زائل ہو گئی۔ اور وہ بھی سوکھے تنے کی طرح اوندھی گر گئیں۔ ہم اس ناگہانی واقعہ سے سہم گئے اچانک آگ کے شعلے بھڑکے۔ اب ہمیں خطرے کا احساس ہوا۔ جب لاشوں نے آگ کا دائرہ پھاندا تو ان کے کفنوں میں آگ لگ گئی۔ جن کے جلنے سے آگ ہال کی چٹائیوں اور دوسری چیزوں تک پہنچ گئی۔ تمام کمرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ ہم بمشکل وہاں سے جان بچا کر بھاگے۔ شمشاد کے کمرے کی طرف آگ تیزی سے پھیل رہی تھی۔ ہم فوراً اس طرف دوڑے۔ ان کو وہاں سے نکال لیا۔ آناً فاناً میں آگ ہر طرف پھیل گئی۔ شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ ہم شمشاد اور اس کے بچے کو یہاں سے اٹھا کر بھاگے اور نزدن کی ٹہنی کی مدد سے اس کھوہ میں داخل ہوئے جس میں سے ندی نکل رہی تھی جب ہم زمین دوز منبع کے قریب گئے تو ایک طرف ہمیں ایک نیچا اور لمبا ٹرنگ نما راستہ دکھائی دیا۔ اس میں کمر کمر تک پانی تھا جس میں ہم کافی دیر تک چلتے رہے اور بدقت تمام اس راستے کو ختم کر کے اس غار میں پہنچے جہاں ہمیں لامیش پکڑ کر لے گئی یقیق

ہم لوگ پانی میں شرابور تھے شمشاد بھی جسے پانی سے بچانے کی ہم نے بہت کوشش کی تھی۔ بھیگ گئی تھی۔

وہ پہلے ہی بخار کی حالت میں تھی۔ بھیگ جانے سے اس پر نمونیے کا زبردست حملہ ہوا۔ اس وقت نہ کوئی دوا میرے پاس تھی نہ علاج کا

کوئی دوسرا ذریعہ تھا۔ اس کی حالت بگڑنے لگی اور رات کے آخری حصے میں وہ جاں بحق ہوگئی .... ہمیں اس کی دردناک موت سے بہت قلق ہوا۔ اور صبح کے وقت میں بصد حزن و ملال مولوی عبد الصمد کے پاس گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ میں نے وہ تمام واقعات جو دیکھے اور سنے تھے اس کے گوش گذار کر دیئے۔ اتفاقیہ وہ جمعہ کا دن تھا مولوی عبد الصمد نے مجھے تسلی دی۔

بعد نماز جمعہ اس نے گاؤں والوں کو (جو اپنے سردار کی گمشدگی پر ہراساں تھے) یہ قصہ سنایا۔ بچہ اُن کے سامنے لایا گیا۔ سردار کی جسوتا کی موت سے ان لوگوں کو یک گونہ رنج تو ہوا۔ مگر بھوتوں کے خاتمہ کی خوشخبری اور بچے کے دیکھنے سے سب مطمئن ہوگئے اور سہ پہر کے وقت شمشاد کو دفن کر دیا گیا۔ بچے کا نام شمشاد خاں رکھا گیا۔ اور اس کے سن بلوغت تک مولوی عبد الصمد عارضی حاکم اور بچے کا اتالیق مقرر ہوا۔ اور فرزانہ رشتی کی پیشین گوئی کے مطابق ننھے سردار کی ماں بنائی گئی۔

شمشاد کی موت سے میرا دل اُچاٹ ہو گیا تھا۔ اس لئے جلد ہی ہم لوگ وہاں سے چلے آئے۔ اب مجھے ان لوگوں کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ البتہ میرے سفید بال اب بھی اس اندوہناک واقعہ کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔

آواگون

میرا پیشہ ڈاکٹری تھا۔ لاشوں کو چیرنا پھاڑنا۔ اور مُردوں کے کفن اُتارنا میرا کام تھا۔ نہ تو میں روحوں کا قائل تھا اور نہ سزا جزا کا معتقد۔ مگر ان واقعات نے جنہیں بیان کرنے والا ہوں میری طبیعت کو بالکل بدل دیا ہے۔

۱۱۔ اپریل ۱۹۲۵ء کا وہ دن ہمیشہ مجھے یاد رہے گا۔ جب مجھے رائے بہادر لالہ امرناتھ کی کوٹھی میں معالج کی حیثیت سے جانا پڑا۔ لالہ صاحب

ایک مدت سے گنٹھیا کے مرض میں مبتلا تھے۔ جب میں ان کی کوٹھی کے پائین باغ میں سے گذر رہا تھا۔ تو میری نظر ایک ایسے دُرِ بے بہا پر پڑی کہ آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔

یہ دُرِ بے بہا ایک نوخیز لڑکی تھی۔ جو لاجوردی رنگ کی ساڑھی میں ملبوس انگور کی بیلوں کے نیچے فرشِ زمین پہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس کے خمدار ابرُوؤں کے نیچے خوشنا غلافی آنکھیں ہزاروں فسوں چھپائے محوِ آرام تھیں۔ سرخ ہونٹوں پر قدرتی مسکراہٹ نمایاں تھی۔ نقاشِ ازل نے اسے معصومیت کا مکمل نمونہ بنایا تھا۔

میری نظریں بے اختیار اس کے چہرے پر گڑ گئیں مجھے خیال ہوا کہ میں اس صورت سے شناسا ہوں مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اُسے کب اور کہاں دیکھا ہے۔ میں ابھی محوِ حیرت ہی تھا کہ ایک ملازم ادھر آنکلا۔

میں۔ یہ لڑکی کون ہے ؟

ملازم۔ یہ رائے بہادر کی اکلوتی بیٹی شانتی ہے۔

میں۔ یہ خاک پہ کیوں پڑی ہے ؟

ملازم۔ یہ بد قسمت لڑکی پاگل ہے۔

میں قدرت کی اس ستم ظریفی پر اظہارِ افسوس کرتا ہوا گھر واپس آگیا اب میں روزانہ رائے بہادر کے معائنہ کے لئے جایا کرتا تھا۔ ایک دن

جب میں ان کے دروازے کے قریب پہونچا تو اندر سے آواز آئی "تم قاتل ہو قاتل"!

میں ٹھٹھک کر وہیں کھڑا ہو گیا۔ رائے بہادر سسکیاں لے کر رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔

رائے بہادر ۔ آہ خدا! میں بڑا دکھی ہوں۔ مجھ پر رحم کر!

دوسری آواز ۔ ہرگز نہیں۔ قاتل کی یہی سزا ہے۔ ایک نہیں دو نہیں۔ اکٹھے تین خون کر کے رحم کی امید فضول ہے۔

رائے بہادر ۔ خدا کے لئے تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔

دوسری آواز کسی عورت کی تھی جو ملازم کے لئے گھنٹی بجا کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ یہ ناگوار گفتگو سن کر میں نے ارادہ کیا۔ کہ واپس چلا جاؤں۔ مگر ملازم کے پاؤں کی آہٹ سن کر مجھے مجبوراً اندر داخل ہونا پڑا۔

رائے بہادر کو میری دوا اور انجکشن سے افاقہ تھا۔ وہ مجھے اپنی طبیعت کا حال سناتے رہے مگر میں نے اُن کی کوئی بات بھی نہ سُنی میں کسی اور ہی خیال میں محو تھا۔ میرے کانوں میں اس عورت کے کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے۔

جب میں مریض سے رخصت ہو کر باہر آیا۔ تو باغ میں شانتی اپنے

کبوتروں کو دانہ ڈال رہی تھی۔ وہ اس وقت سفید رنگ کی معمولی سی دھوتی باندھے ہوئے تھی۔ اس کا معصوم حسن اس سادگی میں بھی برق پاشی کر رہا تھا۔ میں بے خودی کے عالم میں قدرت کی اس حسین تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ کبوتروں پر پیار سے ہاتھ پھیر رہی تھی یکبارگی اس کی نگاہیں اوپر کو اٹھیں۔ وہ مجھے دیکھ کر اچھل پڑی۔ اور دو تین منٹ تک مجھے گھور کر دیکھتی رہی۔ بعد ازاں پریم پریم کہہ کر چیخیں مارتی ہوئی بے تحاشا بھاگ گئی۔ اور میں شرمندہ ہو کر وہاں سے چلا آیا۔

انہیں دنوں میری تبدیلی ہو گئی۔ میں آگرہ سے چلا آیا۔ اور اس واقعہ کو بالکل بھول گیا۔ آگرہ سے آئے مجھے چھ سال گذر گئے گرمیوں کے دن تھے۔ کہ میری تبدیلی جیکب آباد سندھ میں ہو گئی سندھ کی گرمی تو مشہور ہے۔ میں سندھ نہ جانا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے بڑی کوشش کی۔ کہ تبادلہ منسوخ ہو جائے۔ مگر جب مجھے کامیابی نہ ہوئی تو میں نے بددل ہو کر تین مہینے کی رخصت لے لی اور گھر چلا آیا۔

مئی کا مہینہ تھا۔ گرمی اپنے شباب پر تھی شام کے قریب منٹگمری ہال کے سامنے لارنس گارڈن میں ایک بنچ پر بیٹھا سیر کا لطف اٹھا رہا تھا

راہگیروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ہر طبقہ کے لوگ جوق در جوق چل رہے تھے۔ صدہا پری پیکر عورتیں خرام ناز سے سبزۂ خوابیدہ کو پامال کرتی ہوئی ٹہل رہی تھیں۔

یکایک پیچھے سے کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سریلی آواز سے کہا "مسٹر لطیف" میں نے پھر کر دیکھا تو شانتی اپنی پوری رعنائیوں اور دلآویزیوں کے ساتھ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ میں نے اُسے فوراً پہچان لیا اور رعبِ حسن سے سپٹا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے بڑے تپاک سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ وہ ایک قیمتی اور خوش رنگ ساڑھی زیب تن کئے تھی اور اس کے بشرے سے سنجیدگی اور متانت ظاہر ہو رہی تھی۔

میں — آپ یہاں کیسے تشریف لائی ہیں۔ اور راے بہادر کیسے ہیں!

شانتی۔ وہ بدستور علیل ہیں۔ اور میں انہیں کو میو ہسپتال میں داخل کرانے آئی ہوں۔

اس کے بعد ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ رخصت ہوتے وقت وہ کہنے لگی۔

شانتی۔ میں ایک ضروری مسئلے پر جو میری ذات کے متعلق ہے آپ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ کل اسی جگہ مجھے ملیں تو میں آپ سے

کچھ عرض کروں۔

میں اس سے دوسرے دن ملنے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔ مگر حیران تھا کہ مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہے۔ میں تمام رات اسی اُدھیڑ بُن میں مصروف رہا۔

(۲)

دوسری شام کو شانتی پہلے ہی سے میرے انتظار میں وہاں کھڑی تھی۔ ہم دونوں ہجوم سے دور کنج تنہائی میں گھاس کے فرش پر بیٹھ گئے۔

شانتی۔ (آہ سرد بھر کر) مسٹر لطیف! میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ جس موضوع پر میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتی ہوں اس کا آغاز کن الفاظ سے کروں۔ میری باتیں سن کر آپ مجھے ضرور پاگل تصوّر کریں گے۔ مگر میں پاگل نہیں ہوں۔ اور نہ کبھی پاگل تھی۔ لیکن اس گفتگو سے پہلے میں آپ سے التجا کرتی ہوں۔ کہ گو آپ مجھے پاگل ہی سمجھیں پھر بھی میری بات اوّل سے لے کر آخر تک غور سے سنیں۔ اس کے بعد آپ کو اختیار ہے۔ اسے باور کریں یا نہ کریں۔

میں۔ بہت بہتر۔ میں آپ کی ہر ایک بات سننے کو تیّار ہوں۔

شانتی۔ یہ ایک ایسا راز ہے۔ جس کا تعلق میری اور آپ کی ذات سے ہے۔

(پھر کچھ دیر خاموش رہ کر) مسٹر لطیف! آپ کو معلوم ہوگا کہ میرا نام شانتی دیوی ہے۔ لیکن پہلے جنم میں میرا نام بھیاوتی تھا۔ میرا باپ ایک مندر کا پجاری تھا۔ یہ ہشت پہلو مندر چاروں طرف سے خوبصورت اور سر بفلک پہاڑوں سے گھری ہوئی وادی میں واقع تھا جس کے پہاڑ نہایت سرسبز اور شاداب تھے۔ اس وادی میں سنہری گھاس اُگتی تھی۔ جس پر جابجا صد ہا رنگوں کے خودرو پھولوں کی چادریں بچھی رہتیں ان پھولوں پر خوشرنگ تیتریوں کا جمگھٹ بھلا معلوم ہوتا تھا۔

مندر سے پچاس گز کے فاصلہ پر پہاڑ کے دامن میں فیروزی رنگ کی ایک خوشنما گہری جھیل تھی۔ جس میں ایک بلند اور شاندار آبشار گرتا تھا یہ جھیل اس وادی میں بالکل ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے سونے کی خوشنما انگوٹھی کے درمیان فیروزہ جڑا ہو۔ نیلے رنگ کی جھیل میں ننھی ننھی سنہری مچھلیوں کا تیرنا سونے پر سہاگے کا کام دیتا تھا۔

صبح کے وقت جب میں جھیل پر پانی بھرنے جاتی تو ان چھوٹے چھوٹے خوبصورت رنگین پرندوں کے گیت سُن کر جو شمشاد کے بلند درختوں پر اپنی سُریلی آواز میں گاتے رہتے۔ مجھ پر وجد طاری ہو جاتا۔ رات کے

وقت ہوا کے ہلکے اور خوشگوار جھونکے آبشار کی آواز کے ساتھ مل کر ایک دل نشین صورت اختیار کر لیتے تھے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی نامعلوم مغنیہ اپنے پورے سوز و ساز سے موسیقی کی تانیں اڑا رہی ہے، مندر کے دائیں جانب ہمارا چھوٹا سا گؤشالہ تھا اور بائیں جانب ہماری سکونت کے لئے کوٹھڑی بنی تھی۔ مندر کے پچھواڑے کی زمین میں میرا باپ کھیتی باڑی کرتا تھا۔ اور کھیتوں کے اختتام پر ایک فراخ اور ڈھلوان راستہ تھا۔ یہاں سے دو میل کے فاصلے پر ایک ندی تھی جس کے دوسرے کنارے پر ایک گاؤں آباد تھا۔ ندی پایاب تھی۔ اسی راستہ سے ہم لوگ کبھی کبھی گاؤں میں جاتے تھے اور سامان رسد وغیرہ خرید کر واپس آجاتے۔ اور گاؤں کے لوگ بھی اسی راستے ہر مہینہ کے نوچندی اتوار کو اس مقدس جھیل میں اشنان کرنے آتے۔ کاش مجھے اور باتوں کی طرح اس پہاڑ یا وادی وغیرہ کا نام بھی یاد ہوتا۔ میری عمر اس وقت اٹھارہ سال کی ہوگی۔ موسم سرما کا آغاز تھا۔ رات کو خوب برفباری ہوئی۔ صبح میں اٹھی تو پہاڑ اور درخت برف سے سفید ہو رہے تھے۔ تمام وادی روئی کے گالوں سے ڈھکی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جب میں گؤشالہ کی طرف گئی تو گؤشالہ کے دروازے پر کوئی چیز گٹھڑی کی طرح پڑی ہوئی دیکھ کر میں نے پتاجی کو بلایا۔ انہوں نے قریب جا کر دیکھا۔ تو ایک آدمی سردی سے بیہوش

پڑا تھا۔

ہم دونوں نے مل کر اُسے اٹھایا۔ اور اپنی کوٹھڑی میں لے جا کر بستر پر لٹا دیا۔ کمبل اور چیتے کی کھالیں اُس کے اوپر ڈال دیں۔ میں نے آگ روشن کی اور پتاجی اس کے منہ میں انگور کا رس ٹپکانے لگے۔

وہ دوسرے تیسرے دن بالکل تندرست ہو گیا تھا۔ پتاجی نے ہر چند اس سے ایسے وقت پر آنے کی وجہ اور اس کا حسب نسب دریافت کیا۔ مگر وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔

یہ جوان رعنا نہایت تنومند تھا۔ اس کے کاغذی ہونٹ اور ستواں ناک صاف چمکیلی اور خوبصورت آنکھیں۔ فراخ پیشانی اور گھونگریالے بال اور گورا رنگ یہ سب چیزیں ایسی تھیں جو اس کی عالی نسبی کا ثبوت دیتی تھیں وہ نہایت غمزدہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نوجوان کا نام پریم تھا۔ وہ نہایت محنتی اور جفاکش تھا۔ مندر اور کھیتی باڑی کا سارا کام اس نے سنبھال لیا اور پتاجی کی خدمت گذاری بڑی عقیدت مندی سے کرنے لگا۔ پتاجی بھی اس پر بہت مہربان تھے۔ انہوں نے میری شادی اس کے ساتھ کر کے اُسے اپنا جانشین بنا لیا۔

شادی کے بعد میری زندگی کا لطف دوچند ہو گیا۔ میں اس فردوس صفت وادی میں مسرت کے جھولے میں بیٹھ کر محبت کی پینگ بڑھانے لگی

پریم مجھ پر جان فدا کرتا تھا۔ اور میں اس پر پروانہ وار نثار تھی۔ چاندنی راتوں میں ہم دونوں جھیل کے کنارے بیٹھ کر سیر کا لطف اٹھاتے۔ چاند کا عکس پڑنے سے جھیل بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ پریم ایسی دلکش لے میں پہاڑی گیت گاتا۔ کہ بے خودی سے میں اس کے گلے میں باہیں ڈال دیتی۔ اس پر پریم ہنستے ہوئے کہتا "دیکھو بھیا! اس وقت میرے سامنے تین چاند ہیں۔ ایک آسمان پہ دوسرا جھیل میں اور تیسرا گود میں" اس کے ان الفاظ سے مجھے اتنی خوشی حاصل ہوتی کہ میں مدہوش ہو جاتی

صبح کے وقت جب میں جھیل پر پانی بھرنے جاتی۔ تو پریم چھینٹے اڑا کر مجھے بھگونے کی کوشش کرتا۔ جس کے جواب میں میں اس پر پانی سے بھری ہوئی گاگر انڈیل کر خود بھاگ جاتی۔ اور دور جا کر اس کا منہ چڑانے لگتی۔ اس پر وہ مجھے تبسم زا نگاہوں سے گھور کر دیکھتا۔ تو اس کی محبت کا تیر میرے دل میں پیوست ہو جاتا۔

ہم دونوں اکثر اس وادیٔ پربہار میں آنکھ مچولی کھیلا کرتے۔ برسات کے موسم میں دن بھر بھوبٹیاں پکڑنے میں سرگرداں رہتے۔ اور رات کو جگنو پکڑنے میں مصروف ہو جاتے۔ جب میں دیوی کی پوجا کے لئے پھول چننے جاتی تو پریم پیچھے سے آ کر میری آنکھیں بند کر لیتا۔ اور کبھی گدگدی کرنے لگتا۔ جس سے ہنستے ہوئے میں لوٹن کبوتر بن جاتی۔ آہ! وہ دن

کتنے اچھے تھے:۔

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ اور اس کے سینے کے اُتار چڑھاؤ سے اس کے دلی جذبات کا اظہار ہونے لگا۔

شانتی۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) مسٹر لطیف! کیا تم پریم کو جانتے ہو؟

میں۔ (ہنس کر) شانتی میں اُسے کیسے جان سکتا ہوں۔

شانتی۔ مگر تم نے آئینہ میں تو بارہا اپنی شکل دیکھی ہوگی۔؟

شانتی کے منہ سے یہ الفاظ سن کر میں چونک اٹھا۔ مجھے یاد آگیا کہ جب شانتی نے مجھے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ تو پریم پریم کہتی ہوئی بھاگی تھی اور اُس وقت میں نے اس کی اس حرکت کو پاگل پن پر محمول کیا تھا۔

شانتی۔ ہاں ہاں تم وہی پریم ہو۔ تمہاری داہنی طرف کی پسلیوں پر روپے کے برابر چوڑا ایک سفید چاند گرہن کا داغ ضرور ہوگا۔ اور اسی طرف ران پر ایک بڑا سا سیاہ داغ اس زخم کا بھی ہوگا جو گائے کی دولتی لگنے سے ہوا تھا۔ یہ داغ بالکل جانور کے سُم کی طرح درمیان سے پھٹا ہوا تھا۔

میں یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ کیونکہ سچ مچ یہ دونوں نشان میرے بدن پر موجود تھے۔

شانتی (اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے) جب میں اس کیف زاد زندگی کے دور سے گذر رہی تھی تو ایک ایسا اندوہناک واقعہ پیش آیا۔ جس نے خوشیوں اور مسرتوں کے علاوہ ہماری زندگی کا بھی خاتمہ کر دیا۔

میری شادی کو تین سال گذر گئے تھے۔ اسوج کی چوتھی تاریخ تھی سردی غیر معمولی طور پر بڑھ رہی تھی۔ ہواہیں تندی آگئی تھی۔ جو موسم خزاں کا پیش خیمہ خیال کی جاتی ہے۔ اندھیری رات تھی دروازے کی چرچراہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے پریم کو پکارا۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پریم کی چارپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ تو خالی تھی۔ میں نے خیال کیا کہ شاید صبح ہو گئی ہے۔ اٹھ کر دروازہ کھولا لیکن رات کسی مجرم کے دل کی طرح سیاہ تھی۔ میں نے دوبارہ پریم کو پکارا۔ اور جواب نہ ملنے پر اچھی طرح اِدھر اُدھر جھانک کر دیکھا۔ تو معلوم ہوا کہ مندر میں دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔

میں حیران تھی کہ پریم اس وقت مندر میں کیا کرنے گیا ہے۔ میں بھی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی مندر کی طرف گئی۔ دروازہ بند تھا۔ اندر سے سرگوشیوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے درزوں میں سے دیکھا تو تین شخص قریب بیٹھے دکھائی دیئے۔ ان میں ایک پریم تھا دوسرے پتاجی۔ تیسرے کی بابت معلوم نہ ہو سکا۔ میں بٹ سٹ پٹائی

سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ پریم اور پتاجی اتنی رات گئے مندر میں چراغ جلا کر کس سے سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ اس راز کی جستجو میں میں نے مندر کے اِرد گرد چکر کاٹنے شروع کئے مگر بے سود۔ مجھے پتاجی اور پریم پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ کہ انہوں نے کیوں نہ مجھے رازداری کے قابل سمجھا۔

میرے دن رات میں بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ سردی میں کافی دیر کھڑے رہنے سے میری طبیعت خراب ہوگئی اور میں واپس آگئی تکلیف بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ جب پریم واپس آیا تو میری حالت ناگفتہ بہ تھی میں پریم سے سخت ناراض ہونے لگی۔

وہ کہنے لگا۔ لجیا! اس میں میرا کچھ قصور نہیں۔ میں پتاجی کی طلبی پر گیا تھا۔ کیونکہ ایک اناتھ بدھوا مندر میں پناہ لینے آئی تھی۔ اور پتاجی کو اُسے دیوی کی پجارن بنانے پر کچھ رسومات ادا کرنی تھیں۔ میں نے تمہیں بے آرام کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور چپکے سے پتاجی کے ساتھ مندر میں چلا گیا۔

میں اس کے جواب سے مطمئن ہوگئی۔ اس صبح کو میرے بچہ پیدا ہوا۔ اس بدھوا پجارن نے میری بڑی خدمت کی۔ یہ بدھوا خوشرو اور نیک تھی۔ اس کی گود میں چھ سات مہینے کا بچہ تھا۔ اس کا نام ساوتری تھا

اور اُس کے بچے کا نام موہن۔ وہ ہر وقت میری خوشنودی حاصل کرنے میں کوشاں رہتی تھی۔ اور مجھے بھی اس سے کچھ ہمدردی ہو گئی۔

میں اب ہر وقت اپنے بچے مدن کو گود میں لئے بیٹھی رہتی۔ گھر کا سارا کام ساوتری کیا کرتی۔ مجھے اپنے مدن سے بڑی محبت تھی وہ مجھے پریم سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ پریم بھی اس کو بہت چاہتا تھا۔ ساوتری کا بچہ موہن بھی بہت پیارا بچہ تھا۔ موہن نے ایک سال کی عمر میں چلنا پھرنا سیکھ لیا۔ جب پریم مدن کو پیار کرنے لگتا تو وہ بھی پاس آجاتا پریم ایک آہِ سرد بھر کر اس بچے کے سر پر بھی ہاتھ پھیرنے لگتا۔ اور مجھے اس کی یہ حرکت بہت ناگوار گذرتی۔

رفتہ رفتہ میں نے محسوس کیا۔ کہ پریم مدن سے زیادہ موہن کو چاہتا ہے۔ میں نے پتاجی سے اس بات کی شکایت کی۔ تو انہوں نے الٹی مجھ ہی کو ملامت کی۔ اور نصیحت کرنے لگے۔ کہ بے باپ کے بچے پر رحم کرنا چاہیئے۔ میں لاجواب ہو گئی۔ لیکن اس دن سے موہن میری آنکھوں میں کھٹکنے لگا۔

جوں توں کر کے دن گذرتے گئے۔ حتیٰ کہ مدن ڈیڑھ سال اور موہن دو سال کا ہو گیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ موہن ہرن کے بچے سے کھیل رہا تھا۔ اور مدن جھولے میں سو رہا تھا۔ میں نہانے کے ارادے سے جھیل پر

گئی۔ تو مجھے چٹان کے پیچھے باتوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے رنگین پھول والے درخت کی ٹہنیاں سرکا کر دیکھا کہ آبشار کے قریب ساوتری ہاتھ میں گاگر لئے کھڑی ہے۔ اور اس کے پاس پریم کھڑا پیار سے انگلیوں کے ساتھ اس کے بالوں میں کنگھی کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر زمین میرے پاؤں تلے سے نکل گئی۔

پریم کی بیوفائی سے میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں رقابت کی آگ میں جل کر بھسم ہوگئی۔ نہانا وغیرہ بھول گئی۔ اپنی بدقسمتی پر خون کے آنسو بہاتی ہوئی واپس آئی۔ اور مدن کے جھولے کے پاس بیٹھ کر بحرِ تفکرات میں ہچکولے کھانے لگی۔ موہن بدستور ہرن کے بچے سے کھیل رہا تھا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا تو اس کی شکل پریم سے بہت مشابہ معلوم ہوئی۔ مجھے یقین ہوگیا۔ کہ یہ بچہ پریم کا ہے۔ مگر یہ بات میں نے کسی پر ظاہر نہ کی۔

اتفاقاً اسی دن مدن اور موہن مندر کے دروازے پر بیٹھے کھیل رہے تھے۔ موہن نے دروازہ بند کیا۔ اور مدن کی انگلیاں اس میں آگئیں جس سے مدن کی آدھی چھنگلیا بالکل کٹ کر الگ ہوگئی۔ میں پہلے ہی بھری بیٹھی تھی۔ اب تو میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے موہن کو خوب پیٹا اور ساوتری کی سخت بے عزتی کی۔

اب میں بہانے ڈھونڈ کر ساوتری سے لڑنے لگی۔ ہر وقت اس کو

گالیاں دیتی اور اس کے بچے کو کوستی رہتی۔ لیکن اس نے کبھی مجھے کسی بات کا جواب نہ دیا۔ وہ نہایت صبر و تحمل سے سب کچھ سہتی۔ اور میں اس کی خاموشی سے زیادہ چراغ پا ہوتی۔ پریم کو اب بھی مجھ سے بدستور محبت تھی۔ مگر میں اس کو ہرجائی سمجھتی تھی۔

آخر ایک دن میرے جبر و تعدّی سے تنگ آ کر ساوتری اپنے بچے سمیت کہیں غائب ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد پریم مغموم رہنے لگا۔ اب وہ مجھ سے کھچا کھچا رہتا تھا۔ جواب میں میں بھی اس سے نفرت کرنے لگی۔ میرے اس کے تعلقات روز بروز کشیدہ ہوتے گئے۔ وہ ہر دن سرد آہیں بھرتا۔ اور اکثر یاس انگیز گیت گایا کرتا۔ اور شام کے وقت مدن کو لے کر ڈھلوان پہاڑ کے دوسری طرف سیر کو جاتا۔ اور رات کو دیر سے واپس آتا۔

ساوتری کو گئے تین سال گذر گئے۔ پریم کی حالت میں فرق نہ آیا۔ ایک دن جب وہ سیر کو گیا۔ تو میں بھی اس کی نگاہوں سے بچتی۔ درختوں کی آڑ لیتی اس کے پیچھے ہو لی۔ وہ ندی کے کنارے پہنچا۔ تو میں نے خیال کیا کہ وہ گاؤں کی طرف جا رہا ہے۔ مگر وہ بجائے ندی عبور کرنے کے اس کے کنارے سے چلتا ہوا۔ ایک گھنے جنگل میں داخل ہو گیا۔

یہ راستہ بہت دشوار تھا۔ لیکن میں بھی آج پریم کی سیرگاہ کا

کھوج نکالنے پر تلی ہوئی تھی۔ گرتی پڑتی اس کا تعاقب کرتی رہی۔ تقریباً دو میل راستہ طے کرنے کے بعد ایک چھوٹا سا میدان آ گیا۔ جس کے ایک طرف کھڈ میں ندی بہتی تھی۔ اور دوسری طرف پہاڑ بالکل سیدھا چٹان کی طرح کھڑا تھا۔ اس میدان میں ایک بیراگن کی کٹیا تھی۔ جس کے دروازے پر موہن کھڑا تھا۔ اس نے "مدن مدن" کہکر کودنا شروع کر دیا۔ اس کی آواز پر سادتری بھی اندر سے نکل آئی۔ اور مدن کو گود میں لے کر پیار کرنے لگی۔ بعد ازاں وہ لوگ کٹیا کے پچھواڑے کوئی بیس قدم کے فاصلے پر پہاڑ کے دامن میں جا کر غائب ہو گئے۔ میں حیران تھی کہ کہاں گئے۔

میں درختوں میں چھپی رہی۔ جب شام کا دھندلکا چھا گیا تو میں وہاں سے نکل کر دبے پاؤں اس طرف گئی۔ معلوم ہوا وہ ایک غار ہے جس کا دہانہ اتنا چھوٹا ہے کہ انسان بیٹھکر اندر داخل ہو سکتا ہے۔ وہاں پر گھاس کی کھڑکی لگی تھی۔ میں نے سوراخوں میں سے جھانک کر دیکھا۔ اندر چیل کی مشعل روشن تھی۔ یہ غار اندر سے بہت وسیع تھا۔ ایک طرف چارپائی کے برابر پتھروں کا چبوترہ بنا تھا۔ اس پر کچی مٹی سے نہایت دلفریب لپائی کی گئی تھی۔ چبوترے پر کمبلوں کا بستر بچھا تھا۔ اور یہ لوگ انگیٹھی کے قریب بیٹھے تھے۔

چونکہ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ میں بڑی مشکل سے تاریکی میں ٹھوکریں کھاتی ہوئی گھر واپس آئی۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ پریم کا سدھرنا محال ہے۔ اس خیال سے میری طبیعت مضمحل رہنے لگی۔ میرا رنگ زرد ہو گیا۔ میں دبلی اور کمزور ہوتی گئی۔ میری یہ حالت دیکھ کر سب کو فکر پڑ گئی۔ پریم پہلے کی طرح میری دلجوئی کرنے لگا۔ وہ ہر ممکن طریقے سے مجھے خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔ مگر میں اس سے مطمئن نہ تھی۔

ہمارے مندر سے دو دن کے راستے پر ایک شہر آباد تھا۔ جہاں ایک راجہ راج کرتا تھا۔ اس شہر میں ہر سال ساون کے مہینہ بڑا بھاری میلہ لگتا تھا۔ اس میلہ میں کسی دیوتا کے نام کوئی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی۔ جو مجھے اب اچھی طرح یاد نہیں۔ اس دفعہ پتاجی نے مجھے بھی میلہ دکھانے کا ارادہ کیا۔ میرے اور مدن کے نئے کپڑے سلوائے گئے میرے لئے ایک خوبصورت گھوڑا مہیا کیا گیا۔

ہم لوگ دو دن کی مسافت طے کر کے شام کے قریب اس شہر میں پہنچے۔ ایک مندر میں ہم لوگوں نے ڈیرا لگایا۔ یہ شہر دو دریاؤں کے درمیان واقع تھا۔ سڑکوں کے اردگرد سرخ پھولوں سے لدی ہوئی خوبصورت اور گھنی جھاڑیاں شہر کو لالہ زار بنا رہی تھیں۔ شہر سے باہر میلوں تک مکئی کے سرسبز کھیت لہلہا رہے تھے۔ جابجا آبشار

جاری تھے۔ گیا نگاراہماری پُربہار وادی کے مقابلے میں تو کچھ نہ تھا۔ مگر پھر بھی اس شہر کی دلکشی میں کلام نہ تھا۔ شہر کے سامنے ایک وسیع میدان تھا۔ جس کی ہری دوب پر مخملی فرش کا دھوکا ہوتا تھا۔

میلہ بڑی شان و شوکت سے منایا گیا۔ دوسرے دن میں صبح سویرے دریا سے اشنان کر کے واپس آ رہی تھی۔ کہ راستہ میں مجھے ایک آدمی ملا۔ جو بعد میں ہماری تباہی کا باعث ہوا۔ وہ کہنے لگا۔

اجنبی۔ پتری تم کہاں کی رہنے والی ہو؟

میں نے اپنے گاؤں اور مندر والی وادی کا پتہ بتایا۔

اجنبی۔ وہ گھونگریالے بالوں والا آدمی جو کل میلے میں تمہارے ساتھ تھا کون ہے؟

میں۔ وہ میرا پتی ہے۔

اجنبی۔ کیا تمہارے مندر میں کوئی اور عورت بھی رہتی ہے۔

یہ کہہ کر اس نے مجھے اس عورت کا حلیہ بتلایا میں حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔ کیونکہ یہ حلیہ بالکل ساوتری کا تھا۔ وہ میرے بشرے سے بھانپ گیا۔ کہ یہ ضرور اس سے واقف ہے۔ اس نے مکرر مجھ سے یہی سوال کیا۔

میں۔ کیا وہ آپ کی رشتہ دار ہے۔

اجنبی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس پر میں نے اسے جنگل اور غار کا صاف صاف پتہ بتا دیا۔ اس کے بعد وہ بڑبڑاتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ اور میں اپنے ڈیرے پر واپس آ گئی۔

میلہ سے واپسی کو آٹھ دس روز گذر چکے تھے۔ ایک دن پریم مدن کو لے کر سیر کرنے کا بہانہ کر کے باہر چلا گیا۔ اس دن میں غصے کو ضبط نہ کر سکی۔ میں نے پتاجی سے رو رو کر کہنا شروع کیا۔ آپ نے پریم کو اتنا سر پر چڑھا رکھا ہے۔ وہ میری پرواہ ہی نہیں کرتا۔ مگر پتاجی نے میری بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ بلکہ اس کی تعریف کرنے لگے۔

میں۔ آپ کو معلوم ہے۔ اس وقت وہ کہاں گیا ہے؟

پتاجی۔ جہاں اس کا جی چاہے جائے۔ تمہارا اس میں کیا نقصان ہے؟

میں۔ تو کیا میرا کچھ نقصان ہی نہیں۔ اسی کے دکھ سے تو میں گھل کے پارہ ہو گئی ہوں۔ وہ اپنی آشنا کو ملنے جاتا ہے۔ جو پہاڑ کی کھوہ میں رہتی ہے۔

پتاجی۔ لجیا! ایشور سے ڈرو۔ ایسی بات منہ سے نکالنا پاپ ہے

میں۔ (درشتی سے) تو کیا ساوتری اس کی ماں یا بہن ہے جس کے پیچھے وہ دیوانہ ہو رہا ہے۔

پتاجی۔ (گہری سوچ کے بعد) ہاں وہ اس کی بہن ہے۔ اور دکھیا بہن۔

میں۔ اگر وہ اس کی بہن تھی، تو اس نے یہ بات مجھ سے کیوں پوشیدہ رکھی۔

پتاجی۔ یہ میں نے ہی اُسے کہا تھا۔ کہ تم کو کچھ نہ بتائے۔ کیونکہ اس میں ایک گہرا راز تھا۔ جو تم جیسی نادان لڑکی کے سامنے بیان کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔

یہ سُن کر میں خاموش ہو گئی اور اپنی گذشتہ بدسلوکیوں پر پشیمان ہو کر اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی۔ میرا دل پریم کی طرف سے بالکل صاف ہو گیا میں نے دل میں عہد کر لیا کہ جب پریم واپس آئے گا۔ تو پہلے اس سے معافی مانگوں گی۔ پھر صبح ساوتری کو خود جا کر منا لاؤں گی۔ وہ بڑی نیک دل ہے۔ جلد راضی ہو جائے گی۔

رات بہت گذر گئی مگر پریم واپس نہ آیا مجھے بڑا فکر تھا میں نے پتاجی کو مطلع کیا۔ وہ بھی متفکر تو بہت ہوئے۔ لیکن میری تسلّی کے لئے کہا۔ "آسمان ابر آلود ہے۔ شاید ساوتری نے وہیں ٹھہرا لیا ہو۔ تم بھی آ کر سو جاؤ کوئی فکر کی بات نہیں۔" میں اُن کے کہنے سے لیٹ گئی۔ مگر نیند کوسوں دور تھی۔ یہی حال پتاجی کا بھی تھا

جب صبح ہوئی تو میں اور پتاجی پریم کی تلاش میں نکلے۔ ہمیں ڈر تھا کہ رات کو کسی جنگلی جانور نے اس پر حملہ نہ کر دیا ہو۔ چنانچہ ہم دونوں اس غار کے دہانے تک جا پہنچے۔

غار کی کھڑکی ٹوٹی ہوئی تھی۔ یہ غار بہت تاریک تھا۔ پتاجی نے "پریم پریم" کہہ کر آوازیں دینی شروع کیں۔ مگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ ہماری آوازیں سن کر کٹیا میں سے موہن اور بیراگن نکل آئے۔ ہم لوگوں نے سمجھا یہ سب لوگ کٹیا میں سوئے ہوئے ہوں گے۔ ہم نے ادھر کا رخ کیا۔ لیکن بیراگن نے بتایا۔ کہ یہاں صرف موہن ہی سویا تھا۔ جو ہمیشہ اسی کے پاس سویا کرتا ہے۔

ہم لوگوں نے چیل کی مشعل جلائی۔ اور غار میں اتر گئے۔ اُف مسٹر لطیف کیا بتاؤں۔ وہاں کا نظارہ کتنا روح فرسا تھا۔ میرا جگر پاش پاش ہو گیا۔ پتاجی کے ہاتھ سے مشعل گر گئی۔ آہ ہم لوگوں نے دیکھا۔ کہ پریم ساوتری اور مدن تینوں کی لاشیں خاک و خون میں غلطاں پڑی ہیں پریم اور ساوتری کی مشکیں کسی ہوئی تھیں اور کسی نے بڑی بیدردی سے ان کا ایک ایک عضو کاٹ کر ان کو ہلاک کیا تھا۔

تمام غار خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ دیواروں پر بھی جا بجا خون کے چھینٹے پڑے تھے۔ پریم اور مدن کی لاشیں دیکھتے ہی میں تیورا کر گری

اور بے ہوش ہو گئی۔ پھر مجھے پتہ نہیں رہا۔ کہ پتاجی نے کس طرح ان لاشوں کو ٹھکانے لگایا۔ مسٹر لطیف تم جانتے ہو۔ کہ قاتل کون تھا۔ آہ یہ میرے موجودہ پتا رائے بہادر لالہ امرناتھ جی تھے۔ جو اس جنم میں گنٹھیا کی بیماری میں مبتلا ہو کر اپنے کرموں کا پھل پا رہے ہیں۔ میں چونک اٹھا آج سے چھ سال پیشتر رائے بہادر کو کوئی عورت قاتل کہہ رہی تھی وہ شانتی ہی تھی اور اس کا اشارہ انہیں تین مقتولوں کے خون کی طرف تھا۔

میں۔ تمہیں یہ کیونکر معلوم ہوا؟

شانتی۔ یہ میرے گذشتہ پتاجی کی تفتیش کا نتیجہ تھا۔ میں نے جب ان سے اس شخص کے متعلق ذکر کیا۔ جو مجھے میلے کے بعد ملا تھا۔ تو انہوں نے کہا کہ وہی پریم کا قاتل ہے۔

میں۔ مگر یہ تم کس بنا پر کہتی ہو کہ تمہارے موجودہ پتاجی ہی قاتل تھے۔

شانتی۔ جیسے آپ کو پہچانا۔ ویسے ہی ان کو بھی پہچانتی ہوں۔

(پھر اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے) مسٹر لطیف! جب میرے پتاجی مقتولوں کے کریا کرم سے فارغ ہوئے تو ایک رات مجھے مندر میں لے جا کر دیا جلایا۔ اور دروازے کے اندر سے کنڈی لگا کر بیٹھ گئے۔ اور کہنے لگے۔

پتاجی۔ بٹیا! آج میں تمہیں اس مندر میں ایک راز بتانے کے

لئے لایا ہوں۔ یہ وہی راز ہے جو آج سے پانچ سال پیشتر تم سے پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ مگر اب تم پر ظاہر کرنا ضروری ہے۔ آہ! اسی راز کے باعث اتنی خرابیاں پیدا ہوئیں۔ چونکہ میں چراغِ سحری ہوں۔ زندگی کا بھروسہ نہیں۔ اس لئے یہ کام تمہارے ذمہ ہوگا۔ تمہیں اس کو انجام دینا ضروری ہوگا۔

"سنو بچیا! پریم اور ساوتری دونوں حقیقی بھائی اور بہن تھے۔ یہ ذات کے برہمن تھے۔ ساوتری ابھی بہت چھوٹی تھی۔ کہ ان کے والدین مر گئے۔ اس کو پریم نے پرورش کیا۔ ان دونوں کی آپس میں بے حد محبت تھی۔ جب ساوتری جوان ہوئی تو ان کے گاؤں کا سردار جو بہت بوڑھا آدمی تھا۔ اس پر عاشق ہو گیا۔ اس نے کئی ایک خوشامدانہ طریقوں سے ساوتری کا رشتہ پریم سے طلب کیا۔ مگر پریم نے انکار کر دیا۔ جب اس سردار کو اس طرح ناکامی ہوئی۔ تو اس نے جبراً ساوتری کو گھر ڈال لیا۔ پریم بے یار و مددگار تھا۔ وہ اس سردار کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ لیکن شرمندگی سے اپنا گھر چھوڑ دیا۔ سفر کی صعوبتیں سہتا اور مقدس تیرتھوں کی یاترا کرتا ہوا یہاں آنکلا۔ یہ مندر اسے بہت پسند آیا۔ اس نے یہیں رہائش اختیار کر لی۔ اور تمہاری شادی اس سے ہو گئی۔ ادھر ساوتری بے چاری اپنی قسمت پر شاکر تھی۔ مگر اسے سکھ نہ ملا کیونکہ اس

سردار کا لڑکا جو کہ گاؤں اور جاگیر کا وارث تھا۔ ساوتری کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ آخر دو سال کے بعد جب اس نے سنا کہ ساوتری کو بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ تو وہ بہت ہی مشتعل ہوا۔ اور اس نے اپنے باپ کو زہر دلوا دیا۔ بوڑھے سردار نے مرتے وقت ایک وصیت نامہ اور سیاہ رنگ کا ایک ہیرا جو ان کے دستور کے مطابق وراثت کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ ساوتری کو دیا اور کہا کہ "تمہارا بچہ خواہ لڑکا ہو یا لڑکی جب اٹھارہ سال کا ہو جائے۔ تو میرے بڑے لڑکے یا پوتے سے آدھی جاگیر بانٹ لے۔" اس کے بعد اس نے اپنے پرانے جاں نثار کے ساتھ ساوتری کو بھگا دیا۔ تاکہ وہ اسے کسی حفاظت کی جگہ پہنچا دے۔

بوڑھے سردار کی موت کی خبر سن کر جب وارث اس کے گھر پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ ساوتری غائب ہے۔ اور سیاہ ہیروں کی جوڑی میں سے ایک ہیرا بھی غائب ہے۔ انہوں نے اس کی تلاش میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ لیکن بوڑھے خادم نے بھی اس کی حفاظت میں جان لڑا دی۔ وہ پے در پے سفر کرتا ہوا اس شہر میں پہنچ گیا۔ جہاں ہم لوگ میلہ دیکھنے گئے تھے اور وہیں بے چارا مر گیا۔

ساوتری در در کی ٹھوکریں کھاتی کسی طرح بیراگن کی کٹیا تک پہنچ گئی۔ بیراگن نے رحم کر کے اُسے اپنے پاس رکھ لیا۔ اور وہیں موہن

پیدا ہُوا۔ جب چھ مہینے کا تھا تو بیمار ہو گیا۔ ساوتری اسے لے کر گاؤں میں کسی سیانی عورت کو دکھانے جا رہی تھی۔ ادھر پریم سودا سلف خرید کر واپس آ رہا تھا۔ راستے میں بہن بھائی کا میل ہو گیا۔ پریم نے مجھ سے ذکر کیا تو میں نے اُسے صلاح دی کہ ساوتری کو یہیں لے آنا چاہئے۔ چنانچہ اس رات کو جب میں اور پریم آدھی رات کے وقت مندر میں آئے تھے۔ وہ اس ہیرے اور وصیت نامہ ہی کو محفوظ جگہ پر رکھنے کے لئے آئے تھے۔

اس کے بعد پتاجی نے مندر میں کسی جگہ پر کوئی کمانی دبائی جس سے ایک خفیہ خانہ ظاہر ہُوا۔ اس میں ایک وصیت نامہ اور سیاہ رنگ کا ہیرا جو انسانی دل کی شکل میں تراشا ہُوا تھا۔ محفوظ تھا۔ انہوں نے مجھے اس خفیہ خانہ کو کھولنے اور بند کرنے کی ترکیب بھی بتائی۔ جواب مجھے یاد نہیں رہی۔ لیکن اگر اس مندر میں کسی طرح چلی جاؤں تو فوراً یاد آ جائے۔ پھر پتاجی نے مجھے وصیت کی۔ کہ میرے بعد اس ہیرے اور وصیت نامہ کی حفاظت تمہیں کرنا ہو گی۔ موہن کو اپنے بیٹے کی طرح رکھنا ہو گا۔ اور جب وہ اٹھارہ سال کا ہو جائے تو اُسے اس وصیت نامے کی بموجب اس کے باپ کی آدھی جائیداد بھی دلانی ہو گی۔ میں نے پتاجی کو کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مجھ سے اس ذمہ داری کا اقرار

لینا چاہتے تھے۔ مگر جوشِ گریہ سے میری زبان بند ہو چکی تھی۔ آخر پتا جی نے مجھے اس وقت کچھ زیادہ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ اور مجھے صبر کی ہدایت کرتے ہوئے واپس آ گئے

اس رات ان باتوں سے میرے دل پر ایسی چوٹ لگی۔ کہ بیان سے باہر ہے۔ مجھے رہ رہ کر خیال آتا تھا، کہ مجھے موہن کی خاطر زندہ رہنا ہوگا۔ پتا جی مجھے ایسا کیوں کہتے ہیں۔ موہن کو مجھ سے ایسی اہم خدمات حاصل کرنے کا کیا حق ہے۔ یہ لڑکا میرے لئے کتنا منحوس ثابت ہوا۔ آہ کیا یہ کم ہے۔ کہ میرے جگر کا ٹکڑا مدن اس پر قربان کر دیا گیا۔ میرے بچے کو موہن سمجھ کر اس کا خون بہایا گیا۔ میں مدن کے بغیر اٹھارہ سال تک کیسے زندہ رہوں گی۔ ہائے میں اپنے مدن کو کہاں ڈھونڈنے جاؤں یہ خیال ایسا جگر پاش تھا۔ کہ میں نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور بالوں کی لٹیں نوچ کر پھینک دیں اور مجنونانہ کوٹھڑی سے باہر نکل آئی۔

پورنماشی کا چاند اپنی پوری تابانیوں سے چمک رہا تھا۔ میں نے حسرت سے اس کی طرف دیکھا۔ تو مدن اس میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میں نے بازو پھیلا دیئے۔ اور اس کو بلانے لگی۔ مگر وہ بہت دور تھا۔ میں اس کو گود میں نہ لے سکی۔ میں نے ناشپاتی کے درخت کے ساتھ زور زور سے سر ٹپکنا شروع کیا۔ لیکن مدن وہیں کھڑا مسکراتا رہا۔

اچانک پیچھے سے رونے کی آواز آئی۔ آہ یہ تو مدن رو رہا ہے میں نے کان اس رونے پر لگا دیئے۔ نہیں وہ روتا نہ تھا۔ بلکہ وہ مجھے پکار رہا تھا۔ آواز جھیل کی طرف سے آتی تھی۔ میں دوڑ کر جھیل کے کنارے گئی۔ دیکھا تو مدن جھیل کے وسط میں کنول کے پھولوں پر کھڑا مجھے پکار رہا تھا میں آتی ہوں، کہتے ہوئے میں جھیل میں اتر گئی۔ جوں جوں میں آگے بڑھتی گئی تو مدن دور ہوتا گیا۔ یک لخت مجھے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے میں کسی صندوق میں بند ہو گئی ہوں۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے۔ مگر لاحاصل، آخر میں بے ہوش ہو گئی

کچھ دیر بعد سخت تپش سے میری آنکھ کھل گئی۔ تو میں ایک ایسی پُر ہول وادی میں کھڑی تھی۔ جسکی فضا نہایت گھناؤنی اور غم آلود تھی۔ اس وادئ پُر محن کی زمین دلدلی اور گرم تھی۔ رال اور گندھک کی بُو سے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ تمام وادی پر بجائے آسمان کے گہرے سرخ سیاہ زرد اور اُودے رنگ کے باریک تاروں کا گھنا جال تنا ہُوا تھا۔ اور انہیں چار رنگوں کی سخت گرم اور آنکھوں کو اندھا کر دینے والی ناگوار شعاعیں اس منحوس وادی پر محیط تھیں۔

ہر طرف خوف و ہراس طاری تھا۔ ذرّے ذرّے پر ہیبت اور نحوست چھا رہی تھی۔ زمین پر ہزار ہا قسم کے کریہہ المنظر حشرات الارض

تیزی سے رینگتے ہوئے جا رہے تھے۔ بیشمار خوفناک صورت انسان بے تحاشا دوڑتے ایک دوسرے کو دھکیلتے اور ٹکراتے کسی طرف کو جا رہے تھے۔ کئی ایک نے مجھ سے ٹکریں کھائیں۔ مگر وہ مجھ سے مس نہ ہوئے۔ ہر سمت ایک بھیانک اور لرزہ خیز آواز گونج رہی تھی جو کئی انجنوں کی گڑگڑاہٹ بادلوں کی گرج۔ کسی ماتمی راگ اور انسانی چیخوں سے ملتی جلتی تھی۔

میں نے خوفزدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ مگر سوائے چند ایک درختوں کے دھندلے سے نشانات کے جو کئی کوس دور معلوم ہوتے تھے۔ کوئی جائے پناہ نہ دکھائی دی۔ میں سمجھ گئی۔ کہ یہ سب جاندار اسی سائے کی طرف پناہ لینے جا رہے ہیں۔ میرے پاؤں جل رہے تھے۔ اور مجھے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ میں نے بھی اسی سمت دوڑنا شروع کیا۔

راستہ بہت تکلیف دہ تھا۔ جا بجا چھوٹی چھوٹی گھنی جھاڑیاں تھیں۔ جن میں گول گول پھل لگا تھا۔ یہ پھل چاروں طرف سے انگشت بھر لمبے کانٹوں سے پُر تھا جو ایسے زہریلے تھے کہ جس شخص کو چبھتے وہ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگتا۔ بعض بعض جگہ تیرہ و تار غار اور گڑھے تھے۔ جن سے ایسا سیاہ اور کڑوا دھواں نکلتا۔ کہ سر چکرانے

لگتا۔ جو شخص ان میں گر پڑتا، پھر نہ نکل سکتا۔ کئی آدمی میرے دیکھتے دیکھتے اِن غاروں میں غائب ہو گئے۔

اکثر مقامات پر گرم کھولتے ہوئے پانی کے چشمے تھے۔ یہ پانی پیپ اور خون کے رنگ کا اور نہایت بدمزہ اور متعفن تھا۔ گو میں بھی اندھا دھند دوڑ رہی تھی۔ مگر کسی گڑھے یا غار میں گرنے سے محفوظ رہی۔ "آہ یہ خواب ہے یا عالمِ بیداری"؟ کیا خواب اتنا طویل ہو سکتا ہے۔ دفعتہً مجھے یاد آگیا۔ کہ میں مدن کو کنول کے پھولوں پر سے اٹھانے کے لئے جھیل میں اتری تھی۔ شاید میں اس میں ڈوب کر مر گئی ہوں۔ اور یہ جگہ نرک ہے۔

میں سہم گئی اور اسی ششدر پنج میں پھر بدحواسی سے بھاگنے لگی۔ اور ایک مدت دراز تک اسی حالت میں دوڑتی رہی۔ راستہ اتنا لمبا اور کٹھن تھا، کہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ اس سفر کے دوران میں مجھے بے حد روحانی اذیت ہوتی۔ میرے دل پر کوئی ذہنی بوجھ محسوس ہوتا تھا۔ دماغ نہایت پریشان اور پراگندہ ہو رہا تھا۔ روح ذہنی کوفت کے ناقابلِ برداشت حملوں سے مجروح ہو رہی تھی۔ صرف ایک موہوم امید تھی جو مجھے اس طرف لئے جا رہی تھی۔ ایک نامعلوم کشش تھی جو مجھے اس طرف کھینچ رہی تھی۔

آخرِ کار اس وقت یہ مکروہ راستہ ختم ہوا۔ اور میں ان درختوں کے قریب پہنچ گئی۔ ان کے نیچے چند دیو ہیکل اور عجیب الخلقت انسان کھڑے تھے۔ جنہوں نے نیزے تان کر ہمیں آگے بڑھنے سے روک دیا۔ انتہائی کرب سے ہم لوگ گر گئے۔ اور ایڑیاں رگڑ کر سسکنے لگے۔ "اے خدا ہم پر اتنا ظلم نہ کر"۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ یہ نعرہ بلند ہوتے ہی وہ گرج یک لخت بند ہو گئی۔ ایک دیو ہیکل آدمی جو ان میں افسر معلوم ہوتا تھا۔ کہنے لگا۔ خدا ظالم نہیں بلکہ تم خود ظالم ہو۔ دیکھو اس کے بندے کتنے سکھی ہیں۔ اس نے ہاتھ سے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ یکایک سفید براق کی سی روشنی ہم لوگوں پر پڑنے لگی جس کی ٹھنڈک سے ہماری تکالیف فوراً رفع ہو گئیں۔ اور ہم سب شوق اور وارفتگی سے اوپر دیکھنے لگے۔ رنگین تاروں کے جال میں شگاف ہو گیا تھا۔ اور یہ تسکین دہ روشنی اس میں سے آرہی تھی۔ اس شگاف میں ایک ایسی خوبصورت اور وسیع وادی تھی۔ کہ مندر والی وادی اس کے پاسنگ بھی نہ تھی۔ اس میں نہایت دلفریب گل پوش اور ثمردار اشجار تھے۔ اس دلکش وادی کے ذرّے ذرّے سے روح کو مست کرنے والی خوشبودار ہوا کی لپٹیں آرہی تھیں۔ جا بجا سیمگوں پانی کے چشمے جاری تھے۔ جن کے کناروں پر نہایت خوبصورتی سے رنگین اور قیمتی پتھروں کے

مکانات بنائے گئے تھے۔ وہاں کی ہر ایک چیز عجائب روزگار تھی۔

وہاں کے آسمان پر چاند یا سورج کچھ بھی نہ تھا۔ بلکہ وہ وادی خود ہی ایک نور تھی۔ جس کی روشنی صاف اور سبزی مائل سفید تھی۔ کئی حسین اور نوخیز مرد و زن سروں پر سنہری رنگ کے نورانی تاج اور عجیب قسم کے نورانی لباس پہنے محوِ خرام تھے۔ ان کے لباس سے ہلکے رنگوں کی نہایت لطیف اور فرحت بخش شعاعیں نکل رہی تھیں ان کی پیشانیاں چاند کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ سب اوپر کو منہ اٹھائے نہایت اشتیاق سے کسی ایسی چیز کو دیکھ کر جو ہمیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ کیف زا مستی میں جھوم رہے تھے۔

ہم سب (ان کو دیکھ کر حسرت سے) آہ! یہ خوش قسمت لوگ کون ہیں۔ اور کس چیز کو دیکھ کر اس قدر خوش ہو رہے ہیں۔

دیوہیکل آدمی۔ یہ صرف ایک خدا کے پجاری ہیں۔ اور خدائے واحد کا جمال دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں۔

ہم سب۔ ہم بھی تو اسی کی پوجا کرتے ہیں۔

دیوہیکل آدمی۔ نہیں کبھی تم نے ایک خدا سمجھ کر اس کی پوجا نہ کی۔ بلکہ پتھروں۔ جانوروں اور چاند سورج۔ ستاروں کو اس کا شریک بنایا۔

ہم سب۔ مگر اس کے علاوہ تو ہم نے کوئی ایسا جرم نہیں کیا جس کے عوض ہمیں اس ذلت کدے میں لا کر ایسا دردناک عذاب دیا گیا ہے۔

دیوہیکل آدمی۔ اس رحم کرنے والے سچے خدا نے تمہیں کوئی زیادہ عذاب نہیں دیا۔ اور دیگر مجرموں سے الگ رکھا ہے۔ مجرموں کی جگہ بہت بری اور تباہی خیز ہے۔ اس سے پناہ مانگو۔

ہم سب۔ پھر اب ہم لوگ کس جگہ ہیں۔

دیوہیکل آدمی۔ جہاں بے ضرر مشرک رکھے جاتے ہیں۔ ان کو موقع دیا جاتا ہے کہ اس وادی کو عبور کر کے دنیا میں جائیں اور وہاں خدائے واحد کی پرستش کر کے اپنے آپ کو اس خوبصورت وادی میں داخل ہونے کے قابل بنائیں۔ جہاں روح کو مکتی حاصل ہوتی ہے اور نور سے نور ہمکنار ہوتا ہے۔ جو بدنصیب اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے اور دوبارہ شرک و کفر کی زندگی بسر کریں گے وہ پھر اسی جگہ لائے جائیں گے۔ اور اگر شرک و کفر کے ساتھ اور گناہ بھی کریں گے تو ان کا ٹھکانا بہت برا ہوگا۔

اس کے بعد شگاف بند ہوگیا۔ وہ مکروہ شعاعیں بدستور قائم ہوگئیں اور خوفناک آواز پھر شروع ہوگئی۔ ہم لوگ تڑپنے لگے۔ اس دیوہیکل سردار نے ایک مقفل دروازہ جو درختوں کی اوٹ میں تھا۔ کھول دیا۔ اور ہم لوگوں کو اشارہ سے ادھر بلایا۔ ہم نے جلدی سے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اندر

سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ لوگ دھڑا دھڑ اندر داخل ہونے لگے۔ اندر مکمل تاریکی تھی۔ مگر چونکہ ٹھنڈک کافی تھی۔ میں نے بے دھڑک قدم رکھ دیا۔ یکایک مجھے معلوم ہوا۔ کہ میں کسی کنوئیں میں گر گئی ہوں۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

اس بے ہوشی کے دوران میں مجھے نہایت خوشگوار خواب دکھائی دیتے رہے۔ میں نے کئی بار دیکھا۔ کہ ایک بوڑھی عورت جس کے ہاتھ ریشم سے زیادہ ملائم اور آنکھیں مہر و محبت کا سرچشمہ تھیں مجھے نہایت محبت سے میٹھے راگ سنا کر لوریاں دے رہی ہے۔

رفتہ رفتہ میں ہوش سنبھالنے لگی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ میں اس دنیا میں جہاں کہیں وہ مندر والی وادی بھی موجود ہے۔ واپس آگئی ہوں وہ بوڑھی عورت میری نانی اماں تھیں۔ میری ماں مجھے جنم دیتے ہی چل بسی تھیں۔ اس لئے نانی اماں میری پرورش کر رہی تھیں جب میں چار سال کی ہوئی تو ان کی زبانی مجھے معلوم ہوا۔ کہ میرا باپ گنٹھیا کی بیماری میں مبتلا ہے۔ لیکن میں نے باپ کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ کیونکہ وہ دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ ہاں اس کے خطوط اکثر آتے رہتے تھے۔

جب میری عمر پانچ سال کی ہوئی تو نانی اماں مجھے ایک پاٹھ شالہ میں لے گئیں۔ جہاں بہت سے لڑکے لڑکیاں مذہبی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔

جب میں وہاں پہنچی، تو اس وقت عبادت کی گھنٹی تھی۔ خوشبودار دھوپ بتی جل رہی تھی۔ گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ پتھر اور کانسی کی مورتیوں کے سامنے سب بچے ماتھا ٹیک رہے تھے۔ ان کی یہ حرکت دیکھتے ہی میں نے آنکھیں بند کر لیں اور پرلوک کا حال بیان کر کے انہیں اس سے روکا۔ اس دیو ہیکل آدمی کا ذکر سنایا۔ اور وادیٔ نور کا حوالہ دے کر انہیں اس حرکت سے روکنا چاہا۔ مگر ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ بلکہ انہوں نے الٹا مجھی کو پاگل قرار دیا۔ لیکن اس واویلا کا اتنا اثر ضرور ہوا۔ کہ پھر مجھے کبھی وہاں جانے کی زحمت نہ اٹھانا پڑی۔ میری ان باتوں سے لوگ ڈرنے لگے۔ کیونکہ ان کے خیال میں مجھ پر بھوت پلید کا سایہ تھا۔

آخر جب میں سات سال کی تھی۔ تو میری نانی اماں فوت ہو گئیں اب مجھے اپنے باپ کے پاس آنا ضروری تھا۔ میں ایک ملازم کے ہمراہ ان کے گھر لائی گئی۔ مجھے ان کو دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ لیکن جب میں نے انہیں دیکھا تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ کیونکہ میں نے ان کو پہچان لیا وہ وہی شخص تھے۔ جنہوں نے میلے کے موقعہ پر مجھ سے سادری کا پتہ دریافت کیا تھا۔

یہ قصہ ختم کر چکنے کے بعد اس نے اس کے متعلق میرے خیالات کا پتہ لگانا چاہا۔ مگر میرا دماغ اس عجیب و غریب قصے سے مختل ہو رہا تھا

اس لئے میں اس کے متعلق کوئی رائے قائم نہ کر سکا۔ شانتی مجھے اپنی کوٹھی کا پتہ دے کر چلی گئی۔

(۳)

جب میں گھر پہنچا تو دیر ہو چکی تھی لیکن میری بہن زبیدہ ابھی تک میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگی۔ بھائی آج تو آپ نے حد ہی کر دی۔ اتنی دیر کہاں رہے۔ میں نے جواب دیا۔ زبیدہ کچھ نہ پوچھو آج میں نے ایک عجیب قصہ سنا ہے۔ اور اس کو شانتی والا قصہ سنانا شروع کیا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی مگر جب ساوتری اور ہیرے کا ذکر آیا تو وہ چونکنی ہو گئی جب میں یہ قصہ ختم کر چکا۔ تو وہ دریافت کیا۔ کہ اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے وہ کہنے لگی "شانتی کا قصہ بالکل سچا ہے۔ میں اس کی سچائی کا ثبوت دے سکتی ہوں۔

میں۔ وہ کیسے؟

زبیدہ۔ جب ہم لوگ لدھیانہ میں تبدیل ہو کر گئے تھے تو آپ کو یاد ہو گا۔ کہ ہسپتال کے سامنے ایک بوڑھی جاگیردار عورت کی کوٹھی تھی۔

میں۔ ہاں ہاں وہ رادھا ماتا۔ جس کو خفقان کی بیماری تھی۔ جس کا میں اکثر علاج کیا کرتا تھا۔ جو تمہاری منہ بولی ماں تھی۔ اور جس کے خطوط تمہیں

آتے رہتے ہیں۔

زبیدہ - ہاں ہاں وہی - آپ کو معلوم ہے کہ مجھے اس سے کتنی محبت ہے - میں اکثر اس سے ملنے جایا کرتی تھی - ایک دفعہ جب میں اس کے ہاں گئی تو وہ اپنے کمرے میں نہایت مغموم بیٹھی رو رہی تھی - میں نے پوچھا "ماتاجی کیا معاملہ ہے - آپ کیوں رو رہی ہیں -" وہ آہِ سرد بھر کر کہنے لگی " کاش مجھے موقعہ ملتا کہ میں اپنے باپ کی روح کو تسکین دلانے کا باعث ہوتی ——"

بس - ماتاجی وہ ایسا کونسا گناہ آپ کے باپ سے سرزد ہوا تھا جس کی تلافی آپ ناممکن سمجھتی ہیں۔

ماتاجی - زبیدہ یہ بڑی اندوہناک کہانی ہے - صدیاں گذر گئی ہیں یہ جاگیر جس کی مالک اب میں ہوں اور ایک سیاہ رنگ کے ہیروں کی جوڑی ایک راجہ نے میرے آباؤ اجداد میں سے کسی کو انعام دی تھی تب سے ہمارے خاندان میں یہ دستور چلا آتا ہے - کہ جس اولاد کو باپ مرتے وقت وہ ہیروں کی جوڑی دیتا ہے وہی اس جاگیر کا مالک ہوتا ہے - چنانچہ میرے دادا کے بعد میرا باپ ان چیزوں کا وارث ہوتا - مگر قسمت لکھا کون مٹا سکتا ہے - میرے دادا کو بڑھاپے میں ایک برہمن لڑکی سے عشق ہو گیا میرے دادا نے اس لڑکی کے بھائی سے جو کہ اس کا وارث تھا رشتہ مانگا۔

لیکن اس کا بھائی میرے بوڑھے دادا کو بہن کا رشتہ دینے پر رضامند نہ ہوا۔ دادا گاؤں کے سردار تھے۔ اُنہوں نے زبردستی وہ لڑکی اس کے بھائی سے چھین لی۔ وہ بے چارہ مقابلہ کی تاب نہ لا کر کہیں جلاوطن ہو گیا۔

میرے باپ کو اس پر رنج ہونا قدرتی امر تھا۔ کچھ مدت بعد جب میرے باپ نے سنا کہ وہ برہمن لڑکی حاملہ ہے تو اس کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ اس نے طیش میں آ کر اپنے باپ کو زہر دلوا دیا۔ لیکن مرتے وقت میرے دادا نے یہ چال چلی کہ سیاہ ہیروں کی جوڑی میں سے ایک ہیرا اس برہمن لڑکی کو دے دیا۔ گویا آدھی جاگیر کا وارث اس بچہ کو قرار دیا۔ جو برہمن لڑکی کے پیٹ میں تھا۔ اور ایک وصیت نامہ بھی لکھ دیا۔ کہ بچہ کے بالغ ہونے پر وہ آدھی جاگیر وصول کر سکتی ہے۔ وہ لڑکی بھاگ کر کسی طرح اپنے بھائی سے جا ملی۔ تین چار سال تک میرا باپ اس لڑکی کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ آخر میرے باپ نے اس لڑکی کا کھوج لگا لیا۔ اور وہاں جا کر برہمن لڑکی اور اس کے بچے کو معہ اس کے بھائی کے قتل کر دیا۔ مگر وہ ہیرا دستیاب نہ ہو سکا۔

اس قتل و غارت سے ہمارے خاندان پر تباہی نازل ہو گئی میرے باپ کو گنٹھیا ہو گیا۔ اور میرے چار بھائی یکے بعد دیگرے مر گئے۔ اس کے بعد بھی کئی بچے پیدا ہوئے۔ مگر کوئی زندہ نہ رہا۔ سب کے بعد میں پیدا

ہوئی۔ میں گیارہ برس کی تھی۔ کہ میرا باپ اسی کنٹھیا کی بیماری سے فوت ہو گیا۔ میری ماں بڑی دھرماتما تھی۔ وہ اس جاگیر کو ہمیشہ نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی جو انسانی خون بہا کر حاصل کی گئی تھی۔ جب میں جوان ہوئی تو میری ماں نے مجھے اس جاگیر کی اصلیت بتائی۔ اس دن سے یہ جاگیر میرے لئے اجیرن ہو گئی ہے۔ اب میں ہمیشہ خواب میں اپنے باپ کو دکھ درد میں مبتلا دیکھتی ہوں۔ اور اسی وجہ سے بیمار ہوں۔

میں۔ اگر تاتاجی کو معلوم ہو جائے۔ کہ ان کا باپ دوسرے جنم میں اس دنیا میں موجود ہے تو وہ کتنی خوش ہوں۔

زبیدہ۔ ہاں ہمیں ضرور باپ بیٹی کی ملاقات کرانی چاہیئے۔ کیونکہ تم سب کو ایک ہی وقت پھر دنیا میں بھیجنے میں قدرت کا ضرور کوئی راز پوشیدہ ہے۔ تم صبح ایک تار میری بیماری کا تاتاجی کو دیدو۔ تاکہ وہ جلد آسکیں۔

صبح کے وقت لدھیانہ تار دیدیا گیا۔ چنانچہ دوسرے دن تاتاجی تشریف لے آئیں اور زبیدہ کو صحیح وسالم دیکھ کر تار دینے کی وجہ پوچھنے لگیں۔ زبیدہ نے شانتی والا قصہ بیان کیا۔ یہ انوکھی داستان سن کر تاتاجی متعجب ہوئیں۔ اور اپنے بہادر کو دیکھنے کے لئے بے قرار ہو گئیں۔ مگر زبیدہ کی رائے کے مطابق پہلے شانتی سے ملاقات ضروری سمجھ کر ایک دعوتی رقعہ شانتی کو بھیجا گیا۔ چار بجے کے قریب ہمارے مکان کے آگے

ایک خوبصورت کار آکر رُکی۔ اور ملکۂ حسن شانتی "انا البرق" کہتی ہوئی نکل کر بالاخانے پر آئی۔ ہم لوگ اس کے استقبال کو کھڑے تھے۔ جونہی شانتی کی نظر ماتاجی پر پڑی۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا۔ اور وہ فوراً ساوتری ساوتری کہتی ہوئی ماتاجی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر دو زانو بیٹھ گئی۔ اس نئے گل کھلنے پہ ہم لوگ بہت حیرت زدہ ہوئے۔ اور جب ہیرے والا قصہ اور ماتاجی کی شخصیت اس کے سامنے بیان کی گئی تو وہ کہنے لگی۔

آہ! خدا کی شان، ساوتری نے اپنے قاتل کے گھر جنم لیا۔ جب میں نے اُن کو دیکھا تھا، تو یہ نوجوان تھیں۔ اور اب اگرچہ میں ان کو ضعیفی کی حالت میں دیکھ رہی ہوں۔ مگر ان کی شکل بالکل نہیں بگڑنے پائی۔ میں ان کو لاکھ آدمیوں میں پہچان سکتی ہوں کہ یہ وہی ساوتری ہے۔ ہمارے اس طرح دوبارہ ملاپ میں قدرت کا کوئی اہم مقصد ہے جو عنقریب ہم پہ ظاہر ہو جائیگا

(۴۴)

شام کا جھٹپٹا تھا۔ تاریکی ہر طرف اپنا تسلط جما رہی تھی۔ جب میں اور ماتاجی شانتی کے ساتھ میو ہسپتال کے کمرہ نمبر ۱ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ رائے بہادر پلنگ پر لیٹے رو رہے ہیں۔ اور ایک یوروپین نرس ان کے پاس بیٹھی انہیں تسلیاں دے رہی ہے اس کی زبانی معلوم ہوا۔ کہ آج وہ

تمام دن معمول سے زیادہ اُداس رہے اور گریہ وزاری کرتے رہے۔

وہ مجھ سے بہت خوش خلقی کے ساتھ ملے۔ ماتاجی ہمارے پیچھے کھڑی تھیں۔ شانتی ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں رائے بہادر کے پاس لے گئی۔ رائے بہادر کو دیکھ کر ماتاجی کی چیخیں نکل گئیں اور پتاجی پتاجی کہتے ہوئے ان کے قدموں پر جھک گئیں۔ رائے بہادر تعجب سے اس کی حرکتوں کو دیکھنے لگے۔ لیکن میں نے سارا معاملہ انہیں سمجھا دیا۔ اور شانتی کی مجذوبانہ باتوں کی تائید کی۔

اس طویل بیماری، اور شانتی کی عجیب وغریب باتوں نے رائے بہادر کے دماغ میں یہ خیال قائم کر دیا تھا۔ کہ ان کی موجودہ زندگی کا دُکھ ضرور ان کے کرموں کا پھل ہے۔ اور پچھلے جنم کی اصلیت کا انہیں یقین ہو چکا تھا۔

ہم لوگوں نے ماتاجی کو بمشکل رائے بہادر کے قدموں پر سے ہٹا کر ان کے قریب ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ کہنے لگے "رادھا گو پچھلے جنم کی کوئی بات مجھے یاد نہیں۔ مگر پھر بھی تمہاری شکل وصورت شناسا معلوم ہوتی ہے"

ماتاجی نے کہا۔ مگر پتاجی! میں نے تو آپ کو پہچان لیا ہے۔ کیونکہ جس وقت آپ فوت ہوئے تھے تو میں گیارہ برس کی تھی۔

ماتاجی تو اس رات وہیں ہسپتال میں رہیں مگر میں واپس چلا آیا۔ دوسرے دن ہم لوگ رائے بہادر کو ہسپتال سے لے آئے اور ماتاجی کے

اصرار سے ہم سب انہیں لے کر لدھیانہ چلے گئے۔ میں تین مہینہ تک زبیدہ کے ساتھ لدھیانہ میں رہا۔ جب میری رخصت ختم ہوئی تو ماتاجی کہنے لگیں کہ استعفٰی دے کر جاگیر کو سنبھال لو۔ مگر میں نے منظور نہ کیا۔ کیونکہ زبیدہ ترک ملازمت کے خلاف تھی میں اپنی ملازمت پر سندھ چلا آیا۔ لیکن ساتھ ساتھ کوشش میں رہا۔ کہ کسی اور جگہ تبدیل ہو جاؤں۔ آخر میری مراد بر آئی اور اپریل کے شروع میں میرا تبادلہ ڈلہوزی ہو گیا۔

ڈلہوزی خوبصورتی میں شملہ کے ہم پلّہ ہے صانع قدرت نے اس میں رنگینیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ جابجا سیرگاہیں اور چشمے اس کو رشکِ جنت بنا رہے ہیں۔ جدھر دیکھو خدا کی قدرت یاد آ رہی ہے۔ یہاں آکر ہم لوگ بہت مسرور ہوئے۔ ہر اتوار کو جب ہم گرد و نواح میں پکنک پر جاتے تو اکثر اس موقعہ پر زبیدہ شانتی کو یاد کیا کرتی۔ کیونکہ اس کو شانتی سے دلی محبت ہو گئی تھی۔

ڈلہوزی سے بیس میل کے فاصلے پر ریاست چنبہ کا خوبصورت پایۂ تخت واقع ہے۔ یہ شاندار شہر نہایت دلفریب جگہ پر آباد ہے اس کے نیچے گہرائی میں ایک طرف دریائے راوی اپنی پوری شان و شوکت سے بہہ رہا ہے اور دوسری طرف دریائے ساہو شور و غل مچاتا پتھروں میں سر دھنتا اور جھاگ اگلتا تیز رفتاری سے گذرتا ہے۔ ان

دونوں دریاؤں کا مقام اتصال بالکل چنبہ شہر کے پہلو میں واقع ہے۔ اس شہر میں ہر سال ساون کے مہینہ میں ایک بڑا بھاری میلہ لگتا ہے۔ جس میں دریائے راوی کو سانڈ کی قربانی دی جاتی ہے۔

زبیدہ ان پہاڑی عورتوں سے جو کہ ٹلے بیچنے آیا کرتی تھیں، چنبہ کی خوبصورتی کی تعریف سنتی۔ کئی دفعہ اس نے مجھ سے چنبہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی مگر میں اس کو ٹالتا رہا۔ اسی اثنا میں زبیدہ نے ماتا جی کو خط لکھا۔ جس میں ان لوگوں کو ڈلہوزی آنے کی دعوت دی گئی۔ ماتا جی خود تو رائے بہادر کی تیمارداری کی وجہ سے نہ آسکیں لیکن شانتی کو انہوں نے ہمارے پاس بھیجدیا۔ شانتی کے آنے سے ہمارے گھر میں چہل پہل ہو گئی شانتی نے ڈلہوزی کو بہت پسند کیا۔ ایک دن باتوں ہی باتوں میں زبیدہ نے کہا۔ "شانتی بہن ان پہاڑوں کی سیر سے تو جی بھر گیا ہے اب کسی دن چنبہ چلنا چاہیئے۔ اگلے مہینے وہاں ایک میلہ لگے گا۔ جس میں سانڈ کی قربانی ہو گی۔"

شانتی چنبہ کا نام سن کر یک دم چونک اٹھی۔ حیرت سے اُس نے کئی دفعہ یہی الفاظ دُہرائے۔ پھر کسی گہری سوچ میں پڑ گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں شانتی ذرا بیتاب ہو کر کہنے لگی۔ "مسٹر لطیف خدا کے لئے مجھے جلدی چنبہ لے چلو۔ کیونکہ جہاں تک میرا خیال ہے وہ شہر چنبہ ہی تھا جس میں پچھلے جنم میں میلہ دیکھنے

آئی تھی۔ اگر میں وہاں پہنچ جاؤں تو پھر میرے لئے اس حسین وادی تک پہنچنا نہایت آسان ہے۔

میں نے پندرہ دن کی رخصت لی۔ اور ہم لوگ چنبہ کی ہم پر روانہ ہوئے راستے کے شاندار مناظر اور قدرت کے دلچسپ کرشمے دیکھتے ہوئے شام کے وقت چنبہ شہر میں داخل ہوئے۔ شہر کا دروازہ اور چوگان کا میدان دیکھتے ہی شانتی "ہاں یہ وہی ہے۔ ہاں یہ وہی ہے" کہتی ہوئی بے تحاشا ادھر اُدھر دوڑنے لگی۔ ہم لوگ بھی اس کے ساتھ چلتے رہے۔ اس نے ہمیں وہ مندر دکھایا جس میں وہ کسی زمانہ میں آ کر ٹھہری تھی۔ پھر اس نے ساحل کے کنارے ہمیں وہ جگہ دکھائی جس جگہ اس نے قاتل کو ساوتری کا پتہ دیا تھا وہ اسی طرح ماری ماری پھرتی رہی۔ اور کافی اندھیرا ہو جانے پر بڑی دقتوں سے ہم لوگ اس کو ڈاک بنگلہ پہ لائے۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی شانتی اس وادی کے سفر پہ مصر تھی۔ مگر ہم لوگوں نے اسے سمجھا بجھا کر مجبور کر لیا۔ کہ ماتاجی کے بغیر ہمیں اس وادی کا عزم نہ کرنا چاہئے ہمیں چاہئے کہ پہلے انہیں اطلاع دیں اور ان کا جواب آنے پہ مناسب کارروائی کریں۔ چنانچہ میں نے ماتاجی کو خط لکھا۔ "کہ جس وادی کا شانتی حوالہ دیتی تھی اس کا پتہ چل گیا ہے۔ اور آپ جلدی چنبہ شہر کے ڈاک بنگلہ میں ہمیں خود آ کر ملیں۔ یا ہمیں وہاں جانے کی اجازت دیں۔

خط کو لکھے چار دن گذر گئے - یہ دن شانتی کیلئے روزِ محشر سے کم نہ تھے۔ وہ گھڑیاں گن گن کر وقت گذار رہی تھی - اسے کھانے پینے تک کا ہوش نہ تھا - وہ سچ مچ دیوانی ہو رہی تھی - کبھی خود بخود ہنسنے لگتی - اور کبھی رو رو کر باتیں کرتی - ہم لوگ اس کی بے قراری سے متوحش ہو رہے تھے - آخر خدا خدا کر کے چوتھے دن شام کے وقت ماتاجی معہ نوکروں چاکروں کے چنبہ پہنچ گئیں - ہم لوگ جلدی سے اُن کے استقبال کو بالائی منزل سے آئے اس عرصہ میں ماتاجی ڈانڈی سے اُتر چکی تھیں - جب ہم قریب آئے - تو یہ دیکھ کر ہمارے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ دوسری ڈانڈی میں رائے بہادر بھی شالوں میں لپٹے ہوئے لیٹے ہیں۔

ڈانڈی اسی طرح زینے کے راستے ڈاک بنگلہ کی بالائی منزل پر لائی گئی اور رائے بہادر کو پلنگ پر لٹایا گیا - وہ اتنے لمبے سفر سے پژمردہ تو ضرور ہو رہے تھے - مگر انہیں کوئی خاص تکلیف نہ ہوئی تھی - اس کے بعد ڈانڈی والوں اور ملازموں کی رہائش کا بھی مناسب انتظام کیا گیا۔

دوسرے دن صبح نور کے تڑکے ہی ناشتہ کر کے ہم لوگ کھانے پینے کا مناسب سامان لے کر اس وادی کی طرف روانہ ہوئے - ماتاجی اور رائے بہادر ڈانڈیوں پر سوار تھے اور باقی سب گھوڑوں پر - تمام دن ہم لوگ گھنے اور تاریک جنگلوں اور دیوصفت پہاڑوں کا سفر کرتے رہے - شانتی

ہماری راہبر تھی۔ شام کو ہم لوگوں نے تارہ پور نامی ایک چھوٹے سے گاؤں کے مندر میں قیام کیا۔

دوسرے دن پو پھٹے ہم لوگ سفر پر روانہ ہو گئے۔ آج کا سفر نہایت دل خوش کن تھا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے پہاڑوں کا نظارہ نہایت دلفریب ہو رہا تھا۔ ہم لوگ بن کی بہار دیکھتے۔ پیچ و خم کھاتی ہوئی ندیوں اور نغمہ ریز چشموں کی دید سے لطف اندوز ہوتے ہوئے فلک شکوہ پہاڑوں اور جاذب نظر وادیوں کو عبور کر رہے تھے۔ چنانچہ عصر کے قریب ہمارا قافلہ ٹیسا نامی ایک خوبصورت گاؤں میں پہنچ گیا۔

یہ گاؤں ایک کوثر سا ندی کے کنارے آباد تھا۔ یہی وہ گاؤں تھا جس کا ذکر شانتی بڑی حسرت سے کیا کرتی تھی۔ وقت کافی تھا ہم لوگ امی داری تک پہنچ سکتے تھے۔ مگر شانتی کا منشا آج رات یہیں بسر کرنے کا تھا اس لئے وہیں ڈیرہ لگایا گیا۔ شانتی مجھ سے شوق و وارفتگی کے عالم میں کہنے لگی: "مسٹر لطیف! آؤ ہم دونوں مل کر اپنے محبوب کے وطن کی سیر کریں"۔ یہ کہہ کر وہ معصوم بچوں کی طرح دوڑتی ہوئی بازار کی طرف چلی گئی۔ میں بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ ایک ایک دکان پر کھڑی ہوتی اور کسی سے دنی کا پتہ پوچھتی اور کسی سے گوپال اور نند و وغیرہ کا حال دریافت کرتی۔ بعض تو ان ناموں سے لاعلمی کا اظہار کرتے۔ اور بعض کہتے کہ یہ نام ہمارے

باپ دادا کے تھے۔ اور مدت گذری وہ مر چکے ہیں۔ جب اس طرح اسے کامیابی نہ ہوئی۔ تو اس نے گھروں پر جا کر آوازیں دینا شروع کر دیں۔ کئی گھروں سے عورتیں باہر نکل آئیں۔ جن کو وہ کہتی کہ فلاں نام کی عورت کو باہر بھیجو۔ اس پر وہ حیرت سے کہتیں، اس نام کی تو کوئی عورت یہاں نہیں رہتی۔ البتہ ہماری بڑی بوڑھیاں اس نام کی تھیں۔ جو کئی سال ہوئے مر چکی ہیں۔ اس جواب سے شانتی بہت مایوس ہوتی۔

گاؤں کے لوگوں سے اس حسین وادی اور مندر کا نام دریافت کیا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ شیو متھا دیوی کا مندر ہے اور اس وادی کو غبہ متھا استھان کہتے ہیں۔ دوسرے دن نو بجے کے قریب ہم لوگ ٹیما سے روانہ ہوئے آج شانتی غیر معمولی طور پر خاموش تھی۔ گیارہ بجے ہمارا قافلہ شیو متھا میں پہنچ گیا۔ اس وادی کو دیکھ کر ہم لوگ دنگ رہ گئے۔ ہمارے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ایسی بے مثل جگہ اس فانی دنیا میں کہیں ہو سکتی ہے اس جنتِ ارضی پر قدرت کی کاریگری ختم تھی۔

حسن بن صباح کی جنت کا تصور، جو قدیم قصے کہانیاں سن کر ہمارے ذہن میں جاگزیں تھا۔ پھیکا پڑ گیا۔ وادی کی لمبی لمبی سنہری گھاس کندن کی طرح چمک رہی تھی۔ اور اس پر صد ہا رنگ کے خودرو پھول کھلے ہوئے تھے ان پھولوں کی پتیاں ایسی روغنی اور چکنی تھیں کہ ہر پھول بالکل مخمل کا معلوم ہوتا تھا

ان پھولوں کے رنگ اس قدر عجیب و غریب تھے کہ کوتاہ نظر انسان ابھی تک ان رنگوں کے نام بھی تجویز نہ کر سکا تھا۔ ایک ایک پودے میں کئی کئی رنگوں کے پھول لگے تھے۔ ان فلک بوس پہاڑوں میں گھری ہوئی وادی کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ بڑے بڑے عفریت کوہِ قاف کی کسی حسین پری کو آغوش محبت میں لئے بیٹھے ہیں۔ ایک طرف سبز پوش بلند پہاڑ کے دامن میں ایک نیلے رنگ کی وسیع جھیل تھی۔ جس کی خوشنمائی کے مقابلے میں چرخ نیلی فام کا رنگ گرد تھا۔ اس کا پانی ہاتھ میں لینے پر بالکل مصفیٰ اور برف کی طرح سفید اور ٹھنڈا تھا۔

پہاڑ پر سے سفید شفاف پانی کا درخشاں آبشار جھیل میں گر کر ایک تلاطم بپا کر رہا تھا۔ جس کی وجہ سے کنارے کے قریب ننھی ننھی پھوار سی پڑ رہی تھی۔ جھیل میں کہیں کہیں کنول کے بڑے بڑے اور جاذبِ نظر پھول کھلے تھے۔ معطر اور مصفیٰ ہوا سے تمام وادی طبلۂ عطار بنی ہوئی تھی۔ ایک طرف چھوٹی سی ترنم ریز ندی جو اس جھیل سے نکل کر مندر کے پچھواڑے ڈھلوان راستے پر جا رہی تھی۔ کوثر و تسنیم پر خنداں تھی۔ وادی کے ہر چہار جانب دیودار کے بلند قامت درخت پہلو بہ پہلو صف بستہ کھڑے نہایت بھلے معلوم ہوتے تھے اس نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی وادی کو دیکھ کر انسان بے اختیار عش عش کر اٹھتا تھا۔

سب لوگ سیر میں مصروف تھے۔ میں چپکے سے مندر کی طرف نکل آیا۔ مندر کا پجاری اپنی کوٹھڑی میں آسن جمائے کونڈی میں کوئی چیز رگڑ رہا تھا۔ وہ بہت عمر رسیدہ آدمی تھا۔ مگر بالکل گیا گذرا بھی نہ تھا۔ اس کے سست انداز سے پتہ چلتا تھا، کہ وہ بیمار ہے۔ میں نے اُسے سلام کیا۔ وہ بہت خندہ پیشانی سے پیش آیا۔ میں نے پوچھا "آپ کا نام کیا ہے" ؟

پُجاری۔ مجھے موہن لال کہتے ہیں۔

میں۔ آپ سے پہلے یہاں کا پجاری کون تھا ؟

پُجاری۔ پہلے یہاں کے پجاری میرے پتا پنڈت تلسی رام جی تھے۔

میں۔ (دلی جوش کو چھپاتے ہوئے) مگر تلسی رام کی ایک ہی لڑکی تھی جو جھیل میں ڈوب کر مر گئی تھی۔

پُجاری۔ (حیرت زدہ ہو کر) آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا ؟ بیشک اُن کی ایک ہی لڑکی تھی۔ میں ان کا متبنیٰ ہوں۔ میرے ماموں ان کے داماد تھے، جو قتل ہو گئے۔ یہ بڑی لمبی اور پُرانی بات ہے میرے ماموں بالکل آپ سے مشابہ تھے۔

"موہن لال جی" میں نے پجاری سے کہا۔ "میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں"۔ "فرمایئے۔" اُس نے کہا۔ میں نے اوّل سے آخر تک شانتی کی تمام داستان کہہ سنائی۔ وہ کچھ بوکھلا سا گیا۔ اس کا یہ حال دیکھ کر میں نے کہا۔

گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ایسی باتیں دنیا میں ممکن ہیں۔ کیا آپ آواگون کو نہیں مانتے؟

پجاری کی خوش اعتقادی اُڑ گئی۔ وہ میری سب باتوں پر ایمان لے آیا۔ میں دوڑا دوڑا باہر آیا، اور شانتی کو تلاش کرنے لگا۔ وہ ندی کے قریب کسی گہری فکر میں ڈوبی ہوئی بیٹھی تھی۔

میں۔ (دور سے آواز دیتے ہوئے) شانتی چلو موہن بلا رہا ہے۔

شانتی تڑپ اٹھی۔ کیا موہن زندہ ہے؟ اس نے بیتابی سے پوچھا۔

میں اسے لے کر پجاری کے پاس آیا۔ موہن دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ "ماتا مجھیاوتی دیوی کی جے ہو" کہہ کر اس کے پاؤں کے قریب سجدہ میں گر گیا شانتی نے روتے ہوئے اُسے اٹھایا اور کہنے لگی۔

شانتی۔ موہن جب میں مری تھی۔ تو تم بہت چھوٹے تھے۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ میری موت کا پتاجی پر کیا اثر ہوا تھا؟

موہن۔ (شانتی کو ایک چابی دیتے ہوئے) اَسّی سال گذر چکے ہیں۔ پتاجی کی موت کے بعد پھر میں نے یہ دروازہ کبھی نہیں کھولا۔ اب آپ خود اسے کھول کر دیکھیں تو ان کی حالت کا اندازہ آپ کو خود بخود ہو جائے گا۔

(۵)

موہن کو راسے بہادر وغیرہ کی ملاقات کے لئے بھیج کر شانتی نے دروازہ

کھولنا شروع کیا۔ بڑی مشکل سے زنگ آلود تالا کھلا۔ واقعی اندر کا سین کسی دلفگار کی زندگی کا ہو بہو نقشہ تھا۔ اندرونی دیواروں پہ جابجا رنگین قلمی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ جو کسی زبردست مصور کے موقلم کا نتیجہ تھیں ان تصویروں میں عجیب وغریب مناظر دکھائے گئے تھے۔ لجیا کے بچپن کا زمانہ دکھایا گیا تھا۔ جوانی کا۔ کہیں پریم اور لجیا کی شادی، اور ان کی محبت کی زندگی کا فوٹو تھا۔ کہیں مدن کی خوش فعلیوں کے منظر تھے۔ ساوتری۔ موہن۔ بیراگن اور کٹیا اور پہاڑ کی کھوہ اور قتل کا سین بڑی خوش اسلوبی سے دکھایا گیا تھا۔ لجیا کی موت کا سین۔ اور چتا جلتی ہوئی دکھائی گئی تھی۔ یہ کوٹھڑی کیا تھی شانتی کے گذشتہ جنم کی داستان تھی

اس کے علاوہ دیواروں پر ہندی زبان میں بہت سے دردناک اشعار لکھے تھے۔ یہ سب چیزیں تلسی رام کے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی تھیں شانتی مغموم صورت بنائے خاموشی سے سب کچھ دیکھتی جاتی تھی۔ طاق میں ایک کانسی کا سرپوش رکھا تھا جس پہ گرد کی موٹی سی تہ جمی ہوئی تھی شانتی نے اسے اٹھاتے ہوئے بڑی حسرت سے کہا۔ آہ یہ مجھے جہیز میں ملا تھا۔ اور کھول کر دیکھنے لگی۔ اس میں چند ایک زیورات اور چند ڈبیاں تھیں۔ ان ڈبیوں میں سے کسی میں سوکھا ہوا کاجل تھا۔ کسی میں سیندور اور کسی میں خوشبودار سفوف تھا۔

شانتی - آہ ! یہ میرے زیور ہیں - اور یہ میرے سہاگ سنگار کا سامان ہے - اس کے بعد ایک لکڑی کا صندوق کھولا گیا - اس میں چند جوڑے کپڑوں کے پڑے تھے - شانتی ان کپڑوں کو بڑی محبت سے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی اور میں پھر انہیں تصویروں کی دنیا کی سیر کرنے لگا - بعض مناظر سے میرے دل پر ایسی چوٹ لگی - کہ میں بدحواس ہو گیا - میں چاہتا تھا کہ بے اختیار شانتی کو سینے سے لگا لوں -

اس غرض سے میں شانتی کی طرف جھکا - مگر اس کی حالت مجھ سے مختلف تھی - اس پر حسن و محبت کے افسانے کا کوئی اثر نہ تھا - وہ بچے کی تصویر کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی - اور کسی ذہنی اذیت سے اس کا رنگ فق ہو رہا تھا وہ بار بار اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر رہی تھی - میں اس سے اظہار محبت کی جرأت نہ کر سکا - اور اس کے چہرے کے تغیر و تبدل کو دیکھنے لگا - یکایک اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دھارا بہہ نکلا - وہ تصویر کو مخاطب کر کے کہنے لگی -

شانتی - مدن میری آنکھوں کے تارے مدن، میرے جگر کے ٹکڑے مدن، جلد آ - اور اپنے ننھے بازو پھیلا کر میرے سینے سے لپٹ جا - شانتی کی یہ افسوسناک حالت دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا - شانتی بڑی محبت سے یہ الفاظ کہہ رہی تھی - اچانک باہر سے کسی نے توتلی آواز میں کہا -

"میں آتا ہوں اس ہرن کو باندھ لوں۔"

خیالات کا طلسم ٹوٹ گیا۔ ہم دونوں اس آواز پر دروازے کی طرف پلٹے۔ اس وقت ایک پنجسالہ حسین لڑکا آکر شانتی سے چمٹ گیا۔ محبت مادری کا لطیف اور پاکیزہ جذبہ تو ایک مانی ہوئی بات ہے۔ مگر جو نظارہ اس وقت میرے پیش نظر تھا۔ میں اس سے انگشت بدنداں رہ گیا۔ کیونکہ جیسی حالت اس وقت شانتی کی تھی۔ ویسی ہی اس بچے کی بھی تھی جس وارفتگی سے وہ اسے پیار کر رہی تھی۔ اسی طرح وہ بچہ بھی کر رہا تھا۔

اتنے میں موہن مسکراتا ہوا اندر آیا۔ اور عذرخواہی کے طریقے پر کہنے لگا۔ یہ بچہ بہت شریر ہے جب سے اس کی ماں مری ہے۔ ہر ایک کو یونہی دق کرتا ہے۔ موہن سے معلوم ہوا۔ کہ یہ لڑکا اس کا یتیم پوتا ہے۔

شانتی۔ اس بچے کا نام کیا ہے؟

موہن۔ اس بچے کا نام مدن لال ہے۔

شانتی۔ (دیوار پر بنی ہوئی تصویر کی طرف اشارہ کر کے) اور یہ کس کی تصویر ہے؟

موہن۔ پتاجی کہا کرتے تھے کہ یہ لجیاوتی کے بیٹے کی تصویر ہے۔

شانتی۔ موہن اس تصویر کو دیکھو اور اس بچے کو دیکھو۔ تمہیں کیا معلوم ہوتا ہے؟

موہن - اس کی شکل اس تصویر والے بچے سے بہت مشابہ ہے۔

شانتی - مشابہ ہی نہیں - بلکہ یہ وہی تصویر والا بچہ ہے - وہی چہرہ مہرہ، وہی رنگ ڈھنگ، وہی کٹی ہوئی چھنگلیا، جو تم نے دروازہ بند کرنے سے کاٹی تھی۔

شانتی مدن کو اٹھائے ہوئے خوش خوش اپنے ہمراہیوں میں آئی۔ سب کے سب مدن کو دیکھ کر مسرور ہوئے۔ شام کے وقت رائے بہادر کی طبیعت کچھ علیل سی ہو گئی۔ اور موہن کو بھی بخار کی حرارت سی تھی۔ ہم لوگ زبیدہ کو ان کے پاس بٹھا کر خود تینوں مندر میں گئے۔ اس مندر کی عمارت بہت کہنہ اور تاریک تھی۔ اندر کی دیواروں اور طاقچوں سے تیل گھی - سمگری اور باسی پھولوں کی بو نے فضا کو مکدر بنا رکھا تھا۔

دیوار کے ساتھ ایک بڑا تند آور سنگین بت کرسی نما نشست پر بیٹھا تھا شانتی اس بت کو دیکھ کر بہت ہچکچائی - اور پھر کانپتی ہوئی ادھر ادھر کچھ تلاش کرنے لگی۔ اس دیکھ بھال میں دو ڈھائی گھنٹے گذر گئے - آخر جب وہ دیوی کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ترشول پر جھکے ہوئے بت کا معائنہ کر رہی تھی۔ تو یکایک ترشول پر بوجھ پڑنے سے دیوی کی پرشکن پیشانی میں شگاف پیدا ہو گیا شانتی نے اس شگاف میں ہاتھ ڈال کر لکڑی کا ایک منقش ڈبہ نکالا - اور پھر ترشول بدستور اپنی جگہ پر لا کر شگاف بند کر دیا۔

سب کے چہرے فرط طرب سے کھل گئے۔ ڈبے سے سیاہ ہیرا نکال کر

رائے بہادر اور موہن کو دکھایا گیا۔ ماتاجی والا ہیرا بھی اس کے ساتھ رکھ کر مقابلہ کیا، تو یہ دونوں ایک ہی طرح کے ثابت ہوئے۔

اس کے بعد وصیت نامہ پڑھا گیا۔ جو ایک موٹے اور کھردرے دیسی کاغذ پر ہندی زبان میں سردار رام پرشاد کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ کہ میرے بعد آدھی جاگیر کا مالک میرا لڑکا سردار جانکی پرشاد ہوگا۔ اور آدھی جاگیر کا مالک وہ بچہ ہوگا۔ جو ساوتری کے پیٹ میں ہے۔ اگر یہ بچہ زندہ رہے تو اٹھارہ سال کی عمر میں اپنے بھائی سے حصہ لے سکتا ہے۔"

رائے بہادر ان انکشافات سے بہت متاثر ہوئے اور بہت رات گئے تک خدائے واحد سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہے۔ ہم سب موہن اور ننھے مدن کے سمیت ان کے ساتھ دعا میں شامل تھے۔

دوسرے روز علی الصبح ہم لوگ سیر کے واسطے نکل گئے۔ جب واپس آئے تو خلاف معمول رائے بہادر کو سوتے ہوئے پایا۔ ماتاجی نے ناشتہ کے لئے جگانا چاہا۔ مگر انہوں نے جواب نہ دیا۔ ماتاجی نے جلدی سے کمبل ان کے منہ سے ہٹایا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ وہ ابدی نیند سو رہے ہیں۔ ان کے زردی مائل چہرے پر نور برس رہا تھا۔

ان کی اس اچانک موت سے سب کو از حد صدمہ تھا۔ مگر موہن پر ان کی موت کا بہت برا اثر ہوا۔ وہ پہلے ہی چھ سات دن کے بخار اور ان پے در پے

واقعات سے حواس باختہ ہو رہا تھا۔ اس مزید صدمہ کی تاب نہ لا سکا۔ اور بخار کے ساتھ چھاتی کا درد بھی ہو گیا۔ میں نے بہت توجہ سے علاج کیا۔ مگر وعدہ پورا ہو چکا تھا۔ کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ بلکہ درد نمونیہ کی شکل اختیار کر گیا۔ اور رائے بہادر کی موت سے آٹھویں دن وہ بھی ان سے جا ملا۔

میں نے ایک ماہ کی رخصت لی۔ ہم سب چالیس دن تک وہاں رہے شانتی کا ارادہ اب وہیں رہنے کا تھا۔ اس لئے زبیدہ کو اس کے پاس چھوڑ کر میں اور ماتاجی واپس چلے آئے۔ کیونکہ میری رخصت ختم ہو گئی تھی۔ اور ماتاجی کو جاگیر کا ٹھیکہ وصول کرنا تھا۔

ڈلہوزی میں اب میری طبیعت بہت بے لطف رہتی تھی۔ کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ میں دن رات ڈاکیئے کے انتظار میں رہتا۔ جس دن شانتی کا خط ملتا۔ اس دن تو کچھ سہارا ہو جاتا۔ مگر دوسرے دن پھر وہی بیقراری دامنگیر ہو جاتی۔ شانتی کی تصویر میرے دل و دماغ پر حاوی ہو چکی تھی۔ میں نے ہر چند اپنے دل پر جبر کیا۔ اور اس کا خیال دل سے محو کرنے کی کوشش کی۔ مگر یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ تین مہینے جوں توں کر کے گذر گئے لیکن روز بروز میری حالت خراب ہوتی گئی۔

آخر میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک سال کی رخصت لی۔ مگر قدرت خلاف تھی۔ اس سال اتنی برفباری ہوئی۔ کہ چنبہ کا راستہ مسدود ہو گیا

اور متواتر دو مہینے موسم اسی طرح رہا۔ دو مہینہ بعد جب سفر کا ارادہ کر رہا تھا ماتاجی کا تار ملا۔ کہ وہ مدن اور شانتی سے ملنے کے لئے بہت مضطرب ہیں۔ اور ایک دو دن میں ڈلہوزی پہنچنے والی تھی۔

ان کے آتے ہی ہم دونوں نے شبھ متھا کی طرف کوچ کیا۔ گو برف بند ہو چکی تھی۔ اور موسم بھی بہت کچھ تبدیل ہو چکا تھا۔ مگر پھر بھی راستے میں ہمیں بہت دشواریاں پیش آئیں۔ ہمارے بار برداری کے جانور بڑی مشکل سے اس راستے میں سے گذرے۔ اور کئی میل تک ہم لوگوں کو برف پر چلنا پڑا بدقت تمام چھٹے دن ہم لوگ شبھ متھا پہونچے۔

شانتی نہایت محبت سے ہمیں ملی۔ پہاڑ کی خنک و صحت بخش آب ہوا سے اس کا رنگ و روغن خوب نکھر گیا تھا۔ گلاب کے شاداب پھولوں کی طرح اس کے خوبصورت رخساروں کا رنگ جھلک رہا تھا۔ سمور کے سیاہ مالتی لباس میں اس کا جوبن پھٹا پڑتا تھا۔ اس کی مدبھری آنکھیں دلوں پر بجلیاں گرا رہی تھیں۔ میں اس کے چہرے کو نظر بھر کر نہ دیکھ سکا۔ زبیدہ کی صحت بھی بہت اچھی تھی ملازم وغیرہ بھی فربہ اور بشاش تھے۔ مدن تو سمور کے سوٹ میں بالکل ولایتی سیب معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنی چھوٹی سی برف پر چلنے والی گاڑی میں بیٹھ کر برف میں کھیلتا رہتا تھا۔ گویا شانتی کے دم سے جنگل میں منگل ہو رہا تھا۔ اس نے مندر کی کوٹھڑیوں سے علیحدہ ایک موزوں جگہ پر پہاڑی طرز کا

خوبصورت دو منزلہ جھونپڑا بنوا لیا تھا۔ جس میں وہ خود معہ مدلن اور زبیدہ کے رہتی تھی۔ مندر کی ملحقہ کوٹھڑیاں ملازموں اور گودام کے لئے وقف تھیں۔ اناج، گھی اور کوئلہ وغیرہ چھ مہینے کے لئے بافراط کوٹھڑیوں میں بھرا گیا تھا اس کے علاوہ خشک و تر میوہ جات کا بہت بڑا ذخیرہ اس کے پاس جمع تھا ہم لوگ دن رات آتشدان کے قریب بیٹھے خدا کی نعمتوں کا لطف اٹھاتے جھیل شیشہ کی طرح بالکل جمی ہوئی تھی۔ اور پہاڑ پر سے گرنے والا آبشار بھی منجمد ہو کر بلوریں ستون کی طرح کھڑا تھا۔ ہر چیز پر برف کی تہہ چڑھی ہوئی تھی دوپہر کے وقت جب ہوا ساکن ہوتی تو ہم لوگ برف پر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے اور برف کے گولے بنا کر نشانہ بازی کیا کرتے۔

موسم سرما گذر گیا۔ بہار کی آمد سے ہر چیز میں زندگی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ چمک اٹھا۔ قدرت کی رنگینیاں پوری آب و تاب سے آشکارا ہو گئیں۔ ہم لوگ عیش و عشرت سے زندگی گذار رہے تھے شانتی سے میری محبت ترقی پذیر تھی۔ میں اس پر دیوانہ وار فدا تھا۔ مگر چونکہ محبوب کی ہم نشینی حاصل تھی۔ اور جمال مبین کا نظارہ میسر تھا۔ اس لئے میری حرکات و سکنات سے بیقراری کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ میری محبت بالکل خاموش تھی اور کسی کو بھی میرے متعلق اس قسم کا کوئی خیال پیدا نہ ہوا۔ بلکہ خود شانتی بھی اس معاملے میں بے خبر تھی۔ ان ایام میں میں نے کئی دفعہ ارادہ کیا۔ کہ شانتی پر

اپنی محبت کا اظہار کردوں۔ مگر کوئی نہ کوئی ایسا اتفاق ہوتا۔ کہ حرفِ مطلب زبان پہ آکر رُک جاتا

ہمیں اس پُر کیف زندگی میں سات مہینے گذر گئے۔ تو ایک دن مجھ سے ماتاجی کہنے لگیں۔ پریم بیشک اس دنیا کی مسرت تو خوش قسمتی سے میسر ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی ضروری کام اس کو چھوڑ کر کرنے پڑتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ مدن کو متبنیٰ بنا کر جاگیر اس کے نام کردوں۔ کیونکہ قانونی طور پر اس بات کا فیصلہ ہونا چاہیئے۔ اور میرے خیال میں مجھے دو مہینہ کا عرصہ وہاں لگ جائے گا۔ اگر اب میں نے جانے میں دیر کی تو پھر واپس نہ آسکوں گی۔ چونکہ جاڑے کا موسم قریب ہے پھر تو راستے بند ہو جائیں گے۔ سو میں چڑھتے چاند کی تیرہ تاریخ کو یہاں سے جانے کا ارادہ رکھتی ہوں اور مدن کا ساتھ ہے اور خطرہ ہے کہ سفر کی تکلیف سے وہ راستے میں کہیں اُداس نہ ہو جائے اس لئے تم لدھیانہ تک مجھے چھوڑ آؤ۔ زیادہ سے زیادہ تمہیں ایک ہفتہ وہاں لگ جائیگا۔ پھر تم واپس آجانا۔

میں جانا تو نہ چاہتا تھا۔ مگر ماتاجی کے حکم سے انکار نہ کر سکا۔ شانتی نے جب یہ خبر سنی تو وہ خاموش سی ہو گئی۔ میں نے اس کی خاموشی کو مدن کی جدائی سے منسوب کیا۔ زبیدہ بھی میرے ساتھ اپنا کچھ ضروری سامان لینے کے لئے جا رہی تھی۔ تیرہ تاریخ کی صبح کو ہمارا قافلہ تیار تھا شانتی سب کو گلے مل کر

رخصت کر رہی تھی۔ میں نوکروں سے اسباب لدوا رہا تھا۔ میری دلی آرزو تھی کہ شانتی رخصت ہوتے وقت مجھ سے اظہار محبت کا کوئی لفظ کہے اسباب لد چکا تھا۔ مگر میں وہیں کھڑا تھا۔ جب وہ لوگ چلتے ہوئے مندر کے پیچھے آڑ ہوگئے۔ تو میں موقع پا کر شانتی کی طرف گیا۔

وہ ایک درخت کے سہارے کھڑی تھی۔ اس کا رنگ بالکل زرد ہو رہا تھا۔ اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگی: "کاش تم آج کی رات یہاں ٹھہر جاتے۔" میں کچھ کہنے ہی کو تھا کہ ماتاجی کی آواز سنائی دی۔ پریم! جلدی چلو دیر ہو رہی ہے۔

میں نے دیکھا مندر کے دوسرے موڑ پر ماتاجی کھڑی تھیں۔ میں کچھ محجوب سا ہو گیا۔ اور جلدی سے شانتی کو خدا حافظ کہہ کر ان لوگوں سے جا ملا۔

میں تمام دن خاموش رہا۔ میرا دل بہت پریشان تھا۔ میں اپنے آپ کو نفرین کرتا رہا۔ کہ شانتی کی خواہش کے مطابق کیوں نہ آج کی رات وہیں ٹھہر گیا۔ میں نے اس سے کتنی سرد مہری کا سلوک کیا۔ حالانکہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ دوران سفر میں یہی خیال میرے دماغ میں جاگزین تھا شام کے وقت ہم لوگ تاراپور پہنچے۔ سب تھکے ماندے تھے۔ اسی وقت بستروں میں پڑ رہے۔

میں باہر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ شانتی کے الفاظ "کاش تم آج کی رات

یہاں ٹھہر جاتے "۔ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ مجھے رہ رہ کر خیال آتا تھا۔ کہ اس نے مجھے صرف آج کی رات ٹھہرنے کو کہا۔ شانتی نے آج کی رات کو کیوں اتنی اہمیت دی۔ کیا مجھے آج کی رات اس کے ساتھ گذارنا ضروری ہے ابھی تو میں اس سے صرف پندرہ بیس میل ہی دور ہوں۔ انہیں خیالات کے زیر اثر میں نے اٹھ کر چپکے سے گھوڑا کھولا۔ اور تھپتھپا کر کہا بچہ آج تمہیں وفاداری کا حق ادا کرنا ہوگا۔ گھوڑا دن بھر کے سفر سے چور ہو رہا تھا مگر میرے ان الفاظ نے اس میں نئی روح پھونک دی۔ میں سوار ہوا۔ اور وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

(۶)

ساڑھے بارہ بجے کا عمل تھا۔ جب میں شبھ متھا وادی میں داخل ہوا۔ اور گھوڑے کو مندر کے قریب چھوڑ کر خود شانتی کے جھونپڑے کا رُخ کیا۔ جھونپڑے کا دروازہ نیم وا تھا۔ میں دبے پاؤں اندر داخل ہوا۔ اندر ہر طرف خاموشی اور تاریکی تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں میں نے دیکھا تو سب کمرے خالی تھے۔

ایں شانتی کہاں گئی؟ میں بوکھلایا ہوا باہر نکل آیا۔ اور اُسے تلاش کرنے لگا۔ ماہِ چہاردہم پوری آب و تاب سے ضوفگن تھا۔ اس کی روپہلی کرنیں درختوں سے چھن چھن کر گنگا جمنی کا کام کر رہی تھیں۔ جھیل اس وقت ایک ایسا بڑا سنہری طشت معلوم ہوتی تھی۔ جس میں دُرہائے ثمین بارش ہو رہی ہو

آبشار کی ترنم ریز صدا دل کو لُبھا رہی تھی۔ درخت معبود حقیقی کی اطاعت میں دست بستہ خاموش کھڑے تھے۔ دور سے جھیل کے کنارے پر مجھے ایک سایہ دکھائی دیا۔ میں پودوں کی آڑ لیتا دبے پاؤں اس طرف گیا۔ اور ایک گل پوش جھاڑی کے پیچھے ہو گیا۔

میں نے دیکھا۔ کہ شانتی پہاڑی لباس پہنے ایک چھوٹی سی سیمین چٹان پر بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی عنبریں زلفیں عجیب طرز پر گوندھ کر اس طرح شانوں پر چھوڑ رکھی تھیں جس طرح مار سیاہ ہوا میں لہرا رہے ہوں۔ اس کی مخمور آنکھوں میں کاجل کی تحریر غضب ڈھا رہی تھی۔ اس کے گلابی لب مصنوعی سرخی سے بالکل انار کی کلیاں معلوم ہوتے۔ اس کے ماتھے پر قشقہ تھا اور مانگ میں سیندور بھری ہوئی تھی اس نے وہ تمام زیور جو کافی کے سرپوش میں پڑے تھے پہن رکھے تھے۔ اور ایک خاص قسم کی خوشبو میں بسی ہوئی تھی وہ آہستہ آہستہ پہاڑی گیت گانے لگی۔ اس کی مترنم آواز آبشار کی آواز کے ساتھ مل کر وجدانی سماں پیش کرنے لگی۔

گیت ختم ہو گیا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اور چاند کو مخاطب کر کے کہنے لگی:۔ "اے پورنماشی کے حسین چاند، تو نے اپنی دیرینہ سالی میں کئی مایوس تمنا دیکھے ہوں گے۔ مگر سچ بتا۔ کہ مجھ سی بھی کوئی دلفگار ہستی دیکھی ہے۔ جس نے محبوب سے صرف ایک رات ٹھہرنے کی استدعا کی اور اس کی

تمنا پائے استحقار سے ٹھکرائی گئی۔ آہ وہی پریم جس کی یاد مجھے ایک سال سے تڑپا رہی ہے۔ آہ! وہ پریم جس نے ایک وقت مجھ سے مہر و وفا کے بڑے بڑے عہد و پیمان کئے تھے۔ مجھ سے اس قدر بیگانہ ہے۔

"اے روشن چاند! میری کتاب زندگی کا پُردرد ورق میرے مطالعہ سے گذر چکا ہے۔ تو ہی انصاف سے کہہ کہ میں کتنی بدقسمت ہوں اور میری زندگی کس قدر بے ربط۔ آج میری سہاگ رات تھی۔ میں دلہن بنی ہوں۔ وہی شادی کا جوڑا میں نے پہن رکھا ہے۔ وہی میرے زیورات ہیں۔ اور اُنہیں چیزوں سے میں نے سنگار کیا ہے جن سے سہاگ کی رات کیا تھا میں ہر لحاظ سے وہی ایک صدی پہلے کی لجیا ہوں۔ وہی زمین۔ وہی آسمان وہی وادی۔ وہی جھیل۔ مگر میرا سہاگ کہاں ہے۔ میرا پران پتی کہاں ہے آہ مجھ سے کالے کوسوں دور ہے۔ کاش آج کی رات وہ میرے ساتھ گذارتا۔

"اے شریر ستارو! تم کیوں میرا تمسخر اڑاتے ہو۔ اے رحمدل چاند! تو کیوں میرے غم میں اپنے چمکتے ہوئے چہرے کو داغدار بنا رہا ہے۔ اے آبشار، تو کیوں میری سیاہ بختی پر نوحہ کر رہا ہے۔ اے جھیل تیرا دل اس وسیع آبی چھاتی میں کیوں مضطرب ہے؟ آہ! اے سنگدل پریم ایسے وقت میں جبکہ دنیا کی ہر ایک چیز مجھ سے ہمدردی کا اظہار کر رہی ہے۔ تم کیوں نہیں رحم کرتے۔ آہ! کیا آج میری سہاگ کی رات یونہی یاس و اندوہ میں گذر جائیگی کیا تم نہیں آؤ گے۔

یہ سن کر میں بیتاب ہوگیا۔ پودے کی شاخیں ہٹائیں اور کود کر اُسکے سامنے جا کھڑا ہوا۔ "لجیا تمہارا پریم تمہارے ساتھ سہاگ کی رات گذارنے کے لئے میں میل کی مسافت طے کر کے حاضر ہوگیا ہے"۔ میں نے کہا۔ لجیا کے چہرے پر شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے اپنے مرمریں بانہہ پھیلا دیئے۔ اور محبّت کے پیاسے اور دھڑکتے ہوئے دل باہم ملے۔ دو بچھڑی ہوئی روحیں ہم آغوش ہوئیں۔ اور ہم دونوں محبت کے بے پایاں سمندر میں کھو گئے۔

یک لخت ایک دل خراش چیخ لجیا کے منہ سے نکلی۔ اور وہ تڑپ کر میری گود سے گر پڑی۔ میں اس کو اٹھانے کے لئے جھکا۔ تو ایک پھن دار کالا سانپ پھنکارتا ہوا پاس کی جھاڑیوں میں غائب ہوگیا۔ میں نے اسے اٹھایا۔ اور وہ محبّت بھری نگاہوں سے دیکھ کر مجھے کہنے لگی "پریم پریشان نہ ہو۔ خدا کی یہی مرضی تھی۔ اب ہم دونوں وادیٔ نور میں ملیں گے"۔

یہ کہتے ہوئے اس نے دم توڑ دیا۔ دنیا میری نظروں میں اندھیر ہوگئی نہ معلوم کس طرح میں اس لاش کو جھونپڑے تک لایا۔ تمام نوکر وغیرہ بیدار ہوگئے وادی میں کہرام مچ گیا۔ میں پچھاڑیں کھا رہا تھا۔ اور اپنا سر دیواروں سے پھوڑ رہا تھا۔ ملازم میری اس غیر متوقع موجودگی، اور شانتی کی اچانک موت پر حیران ہو رہے تھے۔

میری حالتِ زار دیکھ کر کلیجے پھٹے جاتے تھے۔ یہ صدمہ میرے لئے

نہایت جانگسل تھا۔ آہ! اجل کے بیرحم ہاتھوں نے میری محبوبۂ دل نواز کو میری آغوش محبت سے جُدا کر کے نہایت ستمگری کا ثبوت دیا۔ میں اس ناقابلِ برداشت صدمہ سے بالکل دیوانہ ہوگیا۔ میری سب امیدیں اور تمنائیں شانتی کے ساتھ دفن ہوگئیں۔ میں کبھی قسمت کی نارسائی پر دانت پیستا اور کبھی قضا کو کوستا۔ اسی حالت میں ضعف اور ناطاقتی نے مجھ پر غلبہ پالیا۔ اور مجھ پر غنودگی طاری ہوگئی۔ میں نے دیکھا۔ کہ میں ایک نہایت خوبصورت عالیشان نیم وا دروازے کے قریب کھڑا اندر کی طرف جا رہا ہوں۔ اندر ایک ایسی عجیب و غریب وادی ہے جس کی مثال چشم فلک نے آجتک نہ دیکھی ہوگی۔ وادی کیا ہے ایک نور کا آئینہ خانہ ہے۔ یہ وہ تھا جس کی تعریف میں انسان کی قوت ناطقہ بیکار ہو جاتی ہے۔ اور انسان صُمٌ بُکمٌ کی زندہ مثال بن جاتا ہے۔ یہ وادی جمالِ ربّی کا دلربا عکس تھی۔ جس میں قدرت کے گوناں گوں جلوے نہاں تھے۔ اور اس فرحت افزا وادی میں شانتی نورانی موتیوں کا لباس پہنے کھڑی تھی۔ جو ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔

میں نے کوشش کی کہ دروازہ کھول کر اندر جاؤں۔ مگر دروازہ نہ کھل سکا۔ میں نے شانتی کو آواز دی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور کہنے لگی "پریم! تم چلے جاؤ۔ ابھی تم پر یہ دروازہ نہیں کھل سکتا۔"

یومِ محبّت

کلاک نے ٹن ٹن دو بجائے۔ کیپٹن ناصر جو آتشدان کے قریب آرام چوکی پر اونگھ رہا تھا۔ چونک پڑا۔ خوابگاہ کا دروازہ کھلا دیکھ کر انتہائی اضطراب سے کہنے لگا۔ کیا آج شکیلہ بالکل واپس نہیں آئے گی۔ کیا جو کچھ اس نے کہا ہے۔ اس کو حرف بحرف پورا کرے گی۔ سچ مچ وہ اب میری منحوس شکل نہ دیکھے گی اُف ظالم شکیلہ تو نے دو کوڑی کے ایکٹر زلفی کی خاطر میری محبت کو ٹھکرا دیا۔ میری نرم دلی سے تو نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ میں نے ہر طرح تیری دلجوئی

کی۔ تیرے فعلوں سے چشم پوشی کرتا رہا۔ مگر افسوس تو نے قدر نہ کی۔

وفورِ غم سے اس کا کلیجہ پھٹا جاتا تھا۔ وہ دل کو دونوں ہاتھوں سے دبائے خود بخود پاگلوں کی طرح باتیں کر رہا تھا۔

میرے معبود! میں کس گناہ کی وجہ سے معتوب ہوں۔ ہاں ہاں جو ظلم میں نے آج سے گیارہ برس پیشتر ایک اندھی لڑکی پر کیا تھا۔ اس کی سزا بھگت رہا ہوں۔ اے فرشتہ سیرت نابینا لڑکی میں نے تیری زندگی تباہ کی۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے۔ میں سخت شرمندہ ہوں۔ اگر تو زندہ ہوتی تو میں ضرور اس ظلم کی تلافی کرتا۔ آہ یہ روحانی عذاب میری برداشت سے باہر ہے۔ میں پاپی ہوں۔ دغاباز ہوں، مجھے زندہ نہ رہنا چاہئے۔ اس دنیا میں میرے لئے دلچسپی کا کوئی امکان نہیں۔ یہ کہتے ہوئے اس نے لبادہ اوڑھا۔ اور خودکشی کے خیال سے دبے پاؤں گھر سے نکل گیا۔

(۲)

جب ناصر کی آنکھیں کھلیں۔ تو اس نے ایک نہایت حسین عورت کو جس کی موتی چور آنکھوں سے رحم و ہمدردی ٹپک رہی تھی۔ اپنے اوپر جھکا ہوا پایا۔ میں کہاں ہوں۔ اس نے نقاہت سے کہا۔

"آپ دوستوں میں ہیں۔" حسینہ نے جواب دیا۔

ناصر کے دماغ میں یکے بعد دیگرے سب خیالات آنے لگے۔ اُف کس طرح وہ خودکشی کے ارادے سے چٹان پر کھڑا ہو کر جھیل میں کودا تھا۔

ناصر۔ (اس خیال سے گھبرا کر) آپ کون ہیں اور میں یہاں کیسے پہنچگیا۔

حسینہ۔ میں ایک ماہی گیر کی لڑکی ہوں۔ رات کو جب آپ چٹان سے پھسل کر جھیل میں گرے۔ اس وقت میں اور میرے والد شکار کے انتظار میں اپنی بڑی کشتی کے اندر بیٹھے تھے۔ وہ دھماکے کی آواز سن کر فوراً آپکی مدد کو ناؤ لے کر پہنچ گئے۔ رات بڑی تاریک تھی بمشکل آپ کو بچانے میں کامیاب ہوئے۔ پھر ہم دونوں بڑی دشواری سے آپ کو اپنے جھونپڑے تک لائے چونکہ چٹان کے کسی بڑھے ہوئے پتھر سے ٹکرا کر آپ کے سر میں چوٹ آگئی تھی۔ اس لئے رات بھر آپ بیہوش رہے۔ میرا باپ دیہاتی طریقے پر آپ کا علاج کرتا رہا۔ خدا کا شکر ہے۔ ہماری محنت ٹھکانے لگی۔ اور آپ کی جان بچ گئی۔

ناصر۔ آخر مجھے بچایا کیوں گیا۔

حسینہ۔ یہ ہمارا اخلاقی فرض تھا۔ جو ہم لوگوں نے ادا کیا۔

"ہاجرہ بیٹیا! انہیں آرام کی ضرورت ہے ان سے زیادہ باتیں مت کرو" دوسرے کمرے سے آواز آئی ہاجرہ بہت بہتر کہہ کر ہٹ گئی۔

ناصر نے سر اٹھا کر دیکھا۔ تو دوسرے کمرے میں اُسے ایک خضر صورت

بوڑھا آدمی دکھائی دیا۔ جو مچھلی پکڑنے کے اوزار ٹھیک کر رہا تھا۔ جھونپڑا پھولوں سے لدے ہوئے مرغزار میں واقع تھا۔ مسحور کُن خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جا بجا طاقچوں پر گلدستے رکھے تھے۔ جن کی بھینی بھینی خوشبو سے مشامِ جاں معطر ہو رہا تھا۔ کھلی کھڑکی میں دور سے جھیل کا خوشنما منظر دکھائی دیتا تھا۔

"آہ کیسی پاک و منزہ زندگی ہے"۔ ناصر کی زبان سے بے اختیار نکلا

(۳)

ناصر کی صحت روز بروز بحال ہوتی گئی۔ طاقت و توانائی بخوبی آگئی تھی۔ مگر اُسے یہ درویشانہ زندگی کچھ ایسی بھائی کہ یہیں کا ہو رہا۔ کبھی مہینہ میں ایک دفعہ شہر جاتا اور اپنے کاروبار کی دیکھ بھال کر کے واپس آجاتا۔

بوڑھا سلیمان اور اس کی لڑکی ہاجرہ بھی اس سے کچھ ایسے مانوس ہوئے کہ اُسے اپنے مختصر خاندان ہی کا فرد سمجھنے لگے۔ وہ بھی ہر ایک کام میں ان کا ہاتھ بٹایا کرتا۔ سلیمان گائے دُوہتا تو وہ چارہ ڈالتا۔ ہاجرہ مکھن بلوتی اس کی مدد کرتا۔ جب وہ اپنی مرغیوں کو دانہ ڈالتی۔ تو وہ ڈربے صاف کر دیتا۔ اس کے باغیچہ میں کیاریوں کو پانی دیتا۔ ہر اتوار کو ہاجرہ مکھن، انڈے اور پھل وغیرہ فروخت کرنے کو شہر جاتی تو وہ پیچھے گھر کا سارا کام کرتا۔ پھر پھاٹک پر گھنٹوں اس کا انتظار کرتا رہتا۔ جب وہ واپس آتی۔ تو پھولوں کے خوبصورت

ہار اس کے گلے میں ڈال دیتا۔ جو وہ اسی غرض سے گوندھ کر تیار رکھتا تھا اس سادہ اور قدرتی زندگی نے اس میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ پچھلے تفکرات اس کے دل سے محو ہو چکے تھے۔ اِن دنوں کو وہ زندگی کے بہترین دن سمجھنے لگا۔ اس کے لئے ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ برات سے کم نہ تھی۔ وہ ہاجرہ سے والہانہ محبت کرتا تھا۔ محبت ہی نہیں۔ بلکہ اس کی پرستش کرتا تھا۔ اسے حسینانِ عالم کی سرتاج، مہر و وفا کی دیوی محبّت و صداقت کا مکمل نمونہ سمجھتا تھا۔ ہاجرہ بھی بچّی نہ تھی۔ زندگی کی چھبیس منزلیں طے کر چکی تھی۔ سب کچھ جانتی تھی۔ مگر اس نے کبھی اسے اظہار کا موقع نہ دیا۔

(۴)

عید کا دن تھا۔ شہر میں دکانیں سج گئی تھیں۔ ہر ایک گھر میں چہل پہل نظر آتی تھی۔ طرح طرح کے شغلوں سے عید منائی جا رہی تھی۔ اُدھر دنیا والے اپنی اپنی دھن میں مست تھے۔ اِدھر دنیا سے بے نیاز گوشہ تنہائی کے مکین بھی جنگل میں منگل منا رہے تھے۔ یعنی سلیمان کا خاندان بھی آج جھیل کے کنارے عید منانے آیا ہوا تھا۔ ہاجرہ نے وہ سرخ جوڑا پہن رکھا تھا جو اس کے باپ نے اسے تحفہ عید کے طور پر دیا تھا۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ ہر طرف سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ جھیل آئینہ بن رہی تھی۔ جا بجا کنول کے

پتّوں پر پانی کے موٹے موٹے قطرات ایسے دکھائی دیتے تھے۔ جیسے زمرّدین تھقموں میں سیماب کی لڑیاں ٹوٹ کر بکھر گئی ہوں۔ یہ لوگ اپنی کشتی میں جو پھولوں سے آراستہ کی گئی تھی۔ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے میں کچھ مچھلی اور پرندوں کے کباب تھے۔ ایک سالم بھیڑ کا بچہ تھا۔ جس کے پیٹ میں چاول بھر دم پخت کیا گیا تھا۔ اور فواکہات تھے۔ قہقہے گونج رہے تھے۔ خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ اور یہ لوگ دنیاوی کاہشوں سے آزاد حقیقی مسرّت میں سرشار تھے۔

کھانے سے فارغ ہو کر کشتی سے اترے تو ہاجرہ جھولے میں جا بیٹھی جو اس گلپوش وادی میں ایک اونچے درخت پر اسی کی خاطر ڈالا گیا تھا۔ ناصر جھولا جھلا رہا تھا۔ ہاجرہ نیچے سروں میں گاتی جاتی تھی۔ سلیمان ان دونوں کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ہاجرہ یکایک جھولے سے کود پڑی۔ اس کے چہرے سے تردد کے آثار نمایاں تھے۔ جیسا اکثر اوقات خوشی کے موقعوں پر اس کا حال ہو جایا کرتا تھا۔ اس کا باپ بھی اسے متفکر دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اور کشتی کھول کر وسط جھیل میں شکار کھیلنے چلا گیا۔ ہاجرہ آبشار کے قریب ایک چٹان پر بیٹھ گئی۔

نیلگوں آسمان کا رنگ نکھرا ہوا تھا۔ کہیں کہیں رنگین لکہ ہائے ابر ہواؤں میں تیر رہے تھے۔ سنہری پروں والے پرندے اپنی خوش نوائی سے دلوں

کو مسخر کر رہے تھے۔ آبشار کا شفاف پانی اس کے قدموں پر گوہر آبدار نچھاور کر رہا تھا۔ وہ سرخ لباس میں ملبوس پھولوں کے کنج چٹان پر بیٹھی بالکل دیوی معلوم ہوتی تھی۔ یہ سماں دیکھ کر ناصر کا دل پہلو میں بیقرار ہو گیا۔

ناصر۔ (اس کے قریب دو زانو ہو کر) اے جنت ارضی کی حور ہاجرہ اگر مجھ سے کوئی قصور سرزد ہوا تو معافی چاہتا ہوں۔

ہاجرہ۔ (اپنی پریشانی کو چھپاتے ہوئے) ہائیں! ناصر! یہ کیا!! معافی کاہے کی۔ تم نے کیا قصور کیا۔

ناصر۔ ہاجرہ جب تم خوشی کے موقعوں پر مغموم ہو جایا کرتی ہو تو میں یہی سمجھتا ہوں کہ شاید مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔

ہاجرہ۔ ہرگز نہیں۔ تم نے مجھے کبھی رنجیدہ نہیں کیا

ناصر۔ پھر اس اچانک مغموم ہونے کی وجہ بتاؤ۔

ہاجرہ۔ کیا بتاؤں۔ آہ! تم کیا جانو کہ مجھے کن کن عزیز و اقارب کی یاد ستاتی ہے جن کو زمانہ کے بے رحم ہاتھوں نے مجھ سے جدا کر دیا۔

ناصر۔ ہاجرہ خدا کے لئے اتنا غم نہ کیا کرو۔ مجھے سخت قلق ہوتا ہے۔ میں تمہیں ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔

ہاجرہ۔ آپ کی مہربانی کا شکریہ۔ اب میں ہمیشہ خوش رہنے کی کوشش کروں گی۔

ناصر۔ ہاجرہ شکریہ ادا کرکے میرے جذبات کی توہین نہ کرو۔

ہاجرہ۔ ناصر تمہیں بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا ہے۔ کیسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔

ناصر۔ میری دل و جان کی مالکہ ہاجرہ میں تمہیں چاہتا ہوں۔ تمہاری الفت کا دیوانہ ہوں۔ میری محبت کا جواب محبت سے دو۔

ہاجرہ۔ ناصر اٹھو۔ ان خوشامدانہ باتوں کو ختم کرو۔ میں تم سے بے حد محبت کرتی ہوں ـــــ مگر

ناصر۔ اے ملکۂ حسن یہ مگر کی گرہ کیسی لگائی

ہاجرہ۔ مگر جس طرح ایک حقیقی بہن اپنے چہیتے بھائی سے محبت کرتی ہے۔

ناصر۔ عزیزہ ہاجرہ اتنی ستم ظریفی مجھ سے روا نہ رکھو۔ میں تم سے شادی کی درخواست کرتا ہوں۔ خدا کے لئے میری آرزوؤں کا خون نہ کرو۔

ہاجرہ۔ یہ ناممکن ہے۔ میں شادی بیاہ کے جھمیلوں میں پڑنا نہیں چاہتی۔ میں تم سے پاک محبت رکھتی ہوں۔ اس کو ناپاک کرنے کی کوشش نہ کرو۔ تم کبھی میرے ساتھ شادی بیاہ کرکے خوش نہیں رہ سکتے

یہ دنیا کا دھوکا ہے۔ سراب ہے۔ مایا جال ہے۔ اندھیر نگری ہے۔ اس میں کسی کو دائمی خوشی میسّر نہیں۔ میری بے لوث محبت کی قدر کر۔

(۵)

اس واقعہ کے بعد پھر کبھی ناصر و ہاجرہ کے درمیان شادی کا تذکرہ ہوا وہ بدستور ایک دوسرے سے محبت کرتے رہے۔ بہار گذر گئی۔ خزاں کا دور شروع ہوا۔ ننگے ٹونٹھ دنیا والوں کو درس عبرت دے رہے تھے۔ طوفانی رات تھی۔ ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ بوڑھا سلیمان اپنے جھونپڑے میں زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔ ہر طرف دہشت چھائی ہوئی تھی چراغ کی مدھم لَو عجب بھیانک سماں پیش کر رہی تھی۔ ناصر اور ہاجرہ چارپائی کے قریب سر جھکائے مغموم بیٹھے تھے۔ کچھ دیر بعد بوڑھے نے آنکھیں کھولیں، اور ہاجرہ کو پکارا۔

ہاجرہ۔ پیارے ابا میں حاضر ہوں۔ فرمائیے کیا حکم ہے؟

بوڑھا۔ نورِ چشم ہاجرہ میں اب کوئی دم کا مہمان ہوں۔ اور نہ اب مجھے جینے کی آرزو ہے۔ لیکن یہ حسرت ساتھ لئے جاتا ہوں کہ میں نے تمہارے لئے کوئی اثاثہ باقی نہیں چھوڑا۔ جس سے تم دنیا میں فارغ البالی سے زندگی بسر کر سکو۔ میں تمہیں بے یار و مددگار چھوڑ رہا ہوں۔ اگر تم میری ایک آرزو

پوری کرو۔ تو میں خوشی خوشی اس دنیا سے سدھاروں۔

ہاجرہ۔ اباجان میں بسر وچشم آپ کا ہر ایک حکم بجالانے کو تیار ہوں۔

بوڑھا۔ ہاجرہ اس بستر مرگ پر میرے ساتھ اقرار کرو، کہ میرے بعد تم ناصر سے شادی کرلوگی۔ اگر میری وصیت پوری نہ ہوئی تو مجھے گوشۂ قبر میں بھی چین نہ آئے گا۔

ہاجرہ (روتے ہوئے) اگر آپ کی یہی تمنّا ہے۔ تو میں ضرور اسے پورا کروں گی۔ گو یہ رشتہ میری مرضی کے خلاف ہوگا۔ میں اسے ضرور نباہونگی اور حتی الوسع ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کی کوشش کرونگی۔

بوڑھا۔ شاباش بیٹی۔ تمہاری سعادتمندی سے یہی امید تھی۔ اور اب تمہیں یہ بھی بتادینا چاہتا ہوں کہ ناصر کوئی معمولی آدمی نہیں۔ جب سے یہ ہمارے گھر آئے ہیں۔ میں برابر کھوج لگا تارہا۔ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ یہ اعلیٰ خاندان کے رکن ہیں۔ امیر کبیر آدمی ہیں۔ ان کا بنک چلتا ہے۔ جنگِ عظیم میں کیپٹن کے عہدے پر ممتاز رہ چکے ہیں۔ ایسی ذیشان ہستی صرف تمہاری محبت کی خاطر فقیرانہ زندگی بسر کر رہی ہے۔ ہاجرہ ان کی محبت کا احترام کرو۔ مجھے امید واثق ہے کہ تم ان کی سرپرستی میں باعزت زندگی بسر کرسکوگی۔ (پھر ناصر سے) کیپٹن ناصر میرے پاس آؤ۔

ناصر (چارپائی کی پٹی پر جھک کر) محترم باپ میں حاضر ہوں۔

بوڑھا۔ (ہاجرہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے) بیٹا ناصر! میں ہاجرہ کو تیرے سپرد کرتا ہوں۔ یہ بیکس ہے۔ اس کی دلجوئی کرتے رہنا اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ ایک ہچکی آئی۔ اور روح پرواز کر گئی۔

(۶)

زمانہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے۔ اور دن رات کا چکر نت نئے مناظر پیش کرتا رہتا ہے۔ آبادی کی جگہ پر اُلّو بولتے ہیں۔ اور ویرانوں کی جگہ سر بفلک عمارتیں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح جہاں کبھی بوڑھے سلیمان کا جھونپڑا تھا۔ ایک عالیشان کوٹھی بنی ہوئی ہے۔ اردگرد لوہے کا جنگلہ لگا ہوا ہے۔ اس چھوٹے سے باغیچے کی بجائے ایک وسیع باغ ہے۔ جس کی کانٹ چھانٹ زمانہ حال کے مطابق کی گئی ہے۔ جھیل تک ایک خوبصورت سڑک بنی ہوئی ہے۔ سڑک کے اختتام تک جھیل کے کنارے ایک دلکش بارہ دری ہے۔ اور اس کے سامنے ایک سنگین گھاٹ ہے جس کی سیڑھیاں نیچے تک چلی گئی ہیں۔

یہ کوٹھی کیپٹن ناصر کی ہے۔ ہاجرہ کے ساتھ اس کی شادی کو دس سال گذر چکے ہیں۔ یہ جوڑا نہایت کامیاب زندگی بسر کر رہا ہے۔ ہاجرہ ایک مدبرہ، متین اور سلیقہ شعار بیوی ثابت ہوئی۔ ناصر جب دفتر میں

کاروباری کاغذات کی دیکھ بھال میں مصروف ہوتا۔ تو یہ اپنا وقت تعلیم یا خانہ داری میں صرف کرتی۔ وہ ہر ایک بات میں شوہر کی خوشی کو ملحوظ رکھتی۔ ناصر بھی جو کام کرتا پہلے اس سے صلاح لے لیتا۔

اس کا کاروبار اعلیٰ پیمانے پر چل رہا تھا۔ اس کی وجہ کچھ تو ہاجرہ کے مفید مشورے تھے۔ کچھ اس کے کلرک ضیاء کی دیانتداری۔ ضیاء ایک ہونہار نوجوان تھا۔ کسی نامعلوم خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اور یتیم خانہ میں پرورش پائی تھی۔ چونکہ اعلیٰ صفات کا مالک تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے ناصر کے دل میں جگہ حاصل کر لی تھی۔ جب تک وہ ضیاء کو نہ دیکھ لیتا کھویا سا رہتا۔ وہ اسے ہاجرہ سے دوسرے درجہ پر عزیز تھا۔ وہ اکثر سوچتا۔ کہ کیوں میرا دل خود بخود ضیا کی جانب کھنچا جاتا ہے۔ اس نے مجھ پر کیا فسوں پھونکا ہے۔ مگر وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچتا۔

ناصر ان خوش نصیب لوگوں میں سے تھا جن کو دنیا کی ہر ایک نعمت میسّر ہوتی ہے۔ دولت و عزت، محبت و ہمدردی سب کچھ حاصل تھا۔ صرف اولاد کی کمی تھی۔ سو وہ بھی ریحانہ کے آنے پر پوری ہو گئی۔ یہ ناصر کی یتیم بھانجی تھی۔ جو چودہ سال کی خوبصورت اور بھولی بھالی فرمانبردار لڑکی تھی۔ ناصر و ہاجرہ اسے حقیقی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔ غرضیکہ ہر لحاظ سے ان کی زندگی قابلِ رشک تھی۔ اور وہ ایک کامیاب زندگی کے دور

سے گذر رہے تھے۔

(۷)

یوم حج گذر گیا۔ صبح عید قرباں تھی۔ ناصر اور ہاجرہ ہمیشہ اسی عید پر یوم محبت منانے کے لئے جھیل کے کنارے اسی دلفریب وادی میں جسے قدرت نے اپنے ہاتھ سے سجایا تھا، جاتے۔ اسی طرح کشتی سجائی جاتی جھولا ڈالا جاتا۔ جب وہ ان رنگ رلیوں میں مصروف ہوتے تو انہیں ایسا معلوم ہوتا۔ کہ سلیمان کی روح انہیں پر محبت نگاہوں سے دیکھ کر اس شاندار زندگی پر مبارک باد کہہ رہی ہے۔ سہ پہر کو وہ ان خوش فعلیوں سے فارغ ہو کر سلیمان کی قبر پر جو یہاں سے نزدیک ہی تھی جاتے۔ اور فاتحہ پڑھ کر لوٹ آتے۔

چنانچہ اس سال بھی وہاں جانے کی تیاریاں تھیں۔ صبح کے لئے سب انتظام مکمل ہو گیا۔ رات ہو گئی۔ کھانے کا وقت بھی گذر چکا تھا۔ مگر ناصر کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ ہاجرہ بڑی بے تابی سے اس کا انتظار کر رہی تھی کچھ دیر بعد پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ ناصر اندر داخل ہوا۔ اس کے بال پریشان تھے۔ چہرہ اترا ہوا تھا۔ منہ پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ دھک سے رہ گئی۔ مگر ہمت کر کے شوہر سے بغلگیر ہونے کو بڑھی۔ لیکن وہ اپنے

کہنی کے ٹھوکے سے الگ کر کے کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہُوا۔ اور سگار کے لمبے لمبے کش لگانے لگا فرطِ غم سے ہاجرہ کا دل ٹوٹ گیا۔ مگر اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے پھر ایک دفعہ بڑھی۔ اور دست بستہ اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

ہاجرہ۔ پیارے شوہر مجھ سے کونسا قصور سرزد ہوا ہے۔

ناصر۔ بیرحم ہاجرہ کیا تمہارا قصور تم سے پوشیدہ ہے۔

ہاجرہ۔ خدا کی قسم مجھے اپنے قصور سے لاعلمی ہے۔

ناصر۔ میں اس کا ثبوت دے سکتا ہوں۔

ہاجرہ ضرور میں بھی یہی چاہتی ہوں۔

ناصر نے جیب سے ایک خط نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا۔ اور بولا۔ کیا یہ خط تمہارے ہاتھ کا لکھا ہُوا نہیں ہے۔ جو تم نے میرے کلرک ضیاء کے نام بھیجا ہے۔ اور ان تحائف کا بھی ذکر ہے۔ جو تم نے عید کے لئے اُسے بھیجے ہیں۔ یہ خط کہیں اس کی جیب سے گر گیا۔ جو اتفاقیہ میرے ہاتھ لگ گیا۔ خط سے خوشبو آ رہی تھی۔ جس سے صاف ظاہر تھا۔ کہ کسی عورت کا لکھا ہُوا ہے۔ میں نے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ضیاء کس قماش کا آدمی ہے اور کس قسم کی عورتوں سے اس کا تعلق ہے خط کھول لیا۔ دیکھا تو معاملہ ہی اور نکلا۔ کیا تم نے ضیا کو اپنی سفارش سے ملازمت

نہیں دلائی تھی۔ ان تمام باتوں سے تم انکار کر سکتی ہو۔

ہاجرہ۔ ناصر مجھے ان باتوں سے انکار نہیں (پھر خود بخود) وائے قسمت، جس بات کا ڈر تھا وہ ہو کر رہی۔ ناصر میں نے تم سے پہلے ہی دن کہہ دیا تھا۔ "تم میرے ساتھ شادی کر کے خوش نہیں رہ سکتے۔" وہ ابھی کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر انتہائی غم و الم سے اس کی زبان بند ہو گئی اور آواز اس کے گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ وہ ایک مرمریں بت کی طرح کھڑی التجا آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ناصر۔ دغا باز ہاجرہ! کیا تم اپنے جرم کا اقبال کرتی ہو۔ کاش تمہارا باپ مجھے جیل سے نہ نکالتا۔ میں اسی وقت مرجاتا۔ تو یہ چوٹ بھی باز میرے دل پر نہ لگتی۔ اے بدنام کنندۂ الفت تو نے مجھے اسی لئے بچایا تھا کہ میرا شیشۂ دل سنگِ بیوفائی سے چکنا چور کرے۔ آہ خوبصورت ناگن میں نہ جانتا تھا۔ کہ تیرا دل اتنا سیاہ ہے۔ اُف عورت سے وفاداری کی امید فضول ہے۔ میں کیسا احمق تھا دوبارہ اس آگ سے کھیلا۔ جس نے مجھے جلا کر خاکستر کر دیا۔ اچھا ہاجرہ تم خوش رہو۔ میں اس دنیا سے رخصت ہوتا ہوں۔ جو دن میرا یوم محبت تھا۔ وہی یوم مرگ ہوگا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے جیب سے پستول نکالا اور کنپٹی کے پاس لے جا کر لبلبی کو دبا دیا۔ یکایک کسی زبردست جھٹکے سے اس کا ہاتھ اونچا ہو گیا۔ گولی دماغ

کے پاس سے گذرتی ہوئی چھت میں جا لگی۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھن چکا تھا۔ اور ضیا اس کے سامنے مودبانہ کھڑا تھا۔

ناصر۔ (بے بسی سے) ضیا تمہارا یہاں کیا کام ہے۔ تمہیں اس دخل در معقولات کا کیا حق ہے۔ کیا میری بے بسی پر تمسخر اڑانے آئے ہو۔

ضیا۔ محترم آقا، خدا نہ کرے میں ایسی گستاخی کروں۔ میری جیب سے میری محسنہ کا خط گر گیا تھا جسے تلاش کرتا ہوا میں دفتر تک چلا آیا۔ مگر خط نہ ملا۔ واپسی پر جب میں آپ کی کوٹھی کے نیچے سے گذرا۔ تو معلوم ہوا کہ آپ کسی سے نہایت غصہ میں گفتگو کر رہے ہیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ کہ ہو نہ ہو دال میں کالا ضرور ہے۔ میں آپ کی غلط فہمی دور کرنے کی غرض سے یہاں آیا۔ دیکھا تو یہاں کا منظر ہی اور تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں وقت پر پہنچ گیا۔

ناصر۔ (ذہنی اضطراب سے کراہتے ہوئے) اچھا تم اب مجھے طفل تسلیاں دینے آئے ہو۔ خیر بتاؤ کیا صفائی پیش کرنا چاہتے ہو۔ یہ خط جو ہاجرہ کے ہاتھ میں ہے کس نے لکھا ہے اور کس کو لکھا ہے؟

ضیا۔ میرے محسن بے شک یہ خط آپ کی بیگم صاحبہ نے خاکسار ہی کے نام لکھا ہے۔

ناصر۔ یہ خفیہ خط و کتابت کیوں جاری ہے۔ اور محبت بھرے الفاظ لکھنا چہ معنی؟

ضیا۔ چونکہ بیگم صاحبہ میری رشتہ سے خالہ ہیں یہ بے تکلفی اسی وجہ سے ہے۔

ناصر۔ (گھور کر) چہ خوش یہ کہہ کے کسی اور کو دینا۔ اگر تمہارا ان سے رشتہ تھا۔ تو سلیمان کی زندگی میں ہی تمہارا میل جول ہو جاتا۔ یا کم از کم وہ مجھ سے اس رشتہ داری کا ذکر ہی کرتے۔ میں نے کبھی اُن سے کسی رشتہ دار کا نام نہ سنا تھا۔ اور نہ ہاجرہ نے ابتک کسی بھانجے کے وجود کا اظہار مجھ پر کیا۔

ہاجرہ۔ (کانپتے ہوئے) میرے باپ کو اس رشتہ کا علم نہ تھا کیونکہ اُن سے عمداً چھپایا گیا تھا۔

ناصر۔ چھپانے کی وجہ کیا تھی؟

ہاجرہ۔ رحم میرے محترم شوہر، یہ وجہ میں ضیا کے سامنے نہیں بتا سکتی۔

ناصر۔ (تحکمانہ لہجہ میں) اگر تم سچی ہو۔ تو تمہیں اس کے سامنے بتانا پڑے گا۔

ہاجرہ۔ (جو دیوار کا سہارا لئے بمشکل کھڑی تھی) میرے عزیز شوہر

اگر آپ کی محبت مجبور نہ کرتی۔ تو یہ راز میرے ساتھ قبر میں جاتا۔ مگر آپ کے حکم سے سرتابی کی مجال نہیں۔ سنئے ضیا میرا بیٹا ہے۔ میرے بطن سے پیدا ہوا۔ میرے باپ کو اس کے وجود کا علم نہ تھا۔

ناصر۔ (حیرت سے) گویا یہ تمہاری ناجائز اولاد ہے۔

ہاجرہ۔ دنیا کی نظروں میں تو ناجائز ہے۔ مگر خدا کے نزدیک بالکل جائز۔

ناصر کا جوش و خروش سرد پڑ گیا۔ اس نے اپنے آپ کو صوفے پر گرا دیا۔ اُدھر ضیا فرطِ محبت سے اُچھل کر ہاجرہ سے بغلگیر ہو گیا۔ جس نے بے اختیار اُسے گلے سے لگا لیا۔

(۸)

ناصر صوفے پر نیم دراز تھا۔ غم و غصہ نے اس کو نڈھال کر دیا تھا۔ اس واقعہ سے اس کا دل ہاجرہ کی طرف سے صاف ہو گیا۔ وہ اس ملاپ سے اتنا متاثر ہوا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ہاجرہ اور ضیا سہمے ہوئے اس کے قریب بیٹھے تھے۔ جب رونے دھونے سے اس کا دل ہلکا ہوا۔ تو اُس نے ہاجرہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"ہاجرہ مجھے ضیا کی پیدائش کا مفصل واقعہ سناؤ۔ تاکہ مجھے مزید اطمینان

ہو جائے۔

ہاجرہ ۔ جب میں دو سال کی تھی ۔ تو میری آنکھیں دُکھنے آئیں ۔ اِن دنوں میرا باپ ایک صاحب کے پاس ماہی گیری کی نوکری کرتا تھا اس لئے وہ اکثر گھر سے غیر حاضر رہتا ۔ میری ماں میری دادی کے پاس رہتی ۔ دادی بڑی سخت گیر تھی ۔ اس نے میری آنکھوں کا کچھ علاج نہ کیا ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اندھی ہو گئی ۔ میرا باپ مجھ سے بڑی محبت رکھتا تھا اور میری حالت دیکھ کر کڑھتا رہتا تھا ۔

جب میں دس سال کی ہوئی ۔ تو میرا باپ اپنے صاحب کے ساتھ پردیس چلا گیا ۔ پہلے تو خرچ بھی آتا رہا اور خط و کتابت بھی جاری رہی ۔ مگر کچھ عرصے کے بعد خط و کتابت بند ہو گئی ۔ اور پھر خرچ بھی بند ہو گیا ۔ چند سال تک میری ماں سلائی کر کے گذارہ کرتی رہی ۔ آخر دادی کے مظالم سے تنگ آ کر خالہ کے پاس کلکتہ چلی گئی ۔ اس کی خالہ بیوہ اور بے اولاد تھی ۔ ہم دونوں کو اس نے نہایت محبت سے اپنے پاس رکھا ۔ مگر میری ماں اس طرح بیکار رہنا پسند نہ کرتی تھی ۔ اس لئے اسی خالہ کی وساطت سے کلکتہ کے مشہور تاجر غلام باقر کے ہاں اُسے ملازمت مل گئی ۔ ہم نے اُن کے گھر میں بہت آرام پایا ۔ وہ لوگ مجھ پر بہت مہربان تھے ۔ میری ماں بھی مجھے دُکھیا سمجھ کر کچھ نہ کہتی ۔ جہاں کوئی باتیں کرتا ۔ یا ہنسنے بولنے کی بھنک

تھے۔ دس پندرہ دن تک ہم برابر ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ آخر ایک دن وہ میری ملاقات کو نہ آیا۔ میں دن چڑھے تک اس کا انتظار کرتی رہی۔ مگر بے سود۔ مجھے فکر تھا۔ کہ کہیں وہ بیمار نہ ہو گیا ہو۔

دوسرے دن محمد اصغر سے باتوں میں پتہ چلا کہ اس کے دوست اپنے وطن واپس چلے گئے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی میں بدحواس ہو کر وہاں سے بھاگ آئی۔ اور اپنی کوٹھڑی میں بیٹھ کر سارا دن روتی رہی۔ میری ماں نے بہت پوچھا۔ مگر میں نے کوئی وجہ نہ بتائی۔ اب ایک موہوم سی امید میرے دل میں باقی تھی۔ کہ شاید میرا جذبہ محبت اس کو واپس لائے۔ مگر یہ خیال خام نکلا۔ انور کی بیوفائی سے میرے دل پر ایسی چوٹ لگی کہ میں بیمار ہو گئی۔ جان کے لالے پڑ گئے۔ میری ماں اپنے کام کاج کی وجہ سے میری خاطر خواہ تیمارداری نہ کر سکتی تھی۔ اس لئے اس نے اپنی خالہ کے مشورے سے مجھے ایک خیراتی زنانہ ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ تین ماہ بعد جب میں صحتیاب ہوئی تو مس صاحبہ نے جو نہایت رحم دل لیڈی ڈاکٹر تھیں۔ میری ماں کو بتایا کہ وہ چار ماہ سے حاملہ ہے۔ میری ماں کو اس خبر سے نہایت صدمہ ہوا مگر اس کی خالہ عقلمند اور دوراندیش عورت تھی۔ اس نے میری ماں کو سمجھایا کہ اس خبر کو مشتہر نہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ میں اسی خالہ کے یہاں رہنے لگی۔ اور میری ماں بھی ملازمت چھوڑ کر آ گئی۔ وہیں میرے ہاں بچہ پیدا ہوا۔

جو کہ میری ماں نے اسی خالہ کو دے دیا۔ اور مجھے لے کر اپنے گھر چلی آئی۔ یہاں
آکر معلوم ہوا کہ دادی مرچکی ہے میری ماں نے پھر سلائی کا کام شروع کر دیا کچھ عرصہ
بعد میرا باپ بھی واپس آگیا۔ چونکہ وہ اپنے وطن کو ناپسند کرتا تھا۔ ہمیں لیکر
یہاں چلا آیا۔ ہم لوگ جھونپڑا بنا کر رہنے لگے۔ میرے باپ نے ایک سنیاسی
کو میری آنکھیں دکھائیں۔ اس نے کہا "یہ اپریشن سے ٹھیک ہو جائیں گی"
اپریشن ہوا جو کہ خدا کے فضل سے کامیاب رہا۔ جب چالیس دن کے
بعد میری پٹی کھولی گئی۔ تو میں سب کچھ دیکھ سکتی تھی۔ میں خوشی سے دیوانی
ہو رہی تھی۔ میرے والدین پھولے نہ سماتے تھے۔ پھر ایک دفعہ مجھے اپنی ماں
کے ساتھ کلکتہ جانے کا اتفاق ہوا۔ تو میں نے ضیاء کو اپنی آنکھوں سے دیکھا
اس کی محبت میری رگ رگ میں سرایت کر گئی۔ مگر میں مجبور تھی۔ کیونکہ میں
میں کنواری تھی۔ دوسرے باپ کا ڈر تھا۔ وہ غیرتمند تھے۔ یہ واقعہ سنتے
تو طیش میں آکر خودکشی کر لیتے۔ جب یہ پانچ سال کا ہوا۔ تو میری ماں کی خالہ
نے رحلت کی۔ بچہ اکیلا رہ گیا۔ اب میری ماں اسے پوشیدہ طور پر کلکتہ سے
لے کر آئی۔ اور یہیں دارجیلنگ کے یتیم خانہ میں داخل کرا دیا۔ اب ہم دونوں
شہر جا کر اس کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ جب یہ سات برس کا ہوا۔ تو میری
ماں نے بھی قضا کی۔ پھر میں خود خفیہ طور پر اس کی نگراں رہی۔ اور روپیہ
پیسہ یتیم خانہ کے معلموں کو دیتی رہی۔ اسی وجہ سے اس کا خیال رکھا گیا۔ اور

اس کی تعلیم و تربیت اچھی ہوئی۔ اکثر خوشی کے موقعہ پر مجھے اس کی یاد بے چین کر دیتی تھی۔ جیسے آپ نے بھی بارہا محسوس کیا۔

میں نے تہیہ کر لیا تھا۔ کہ اب میں ضیا کی خاطر شادی نہ کروں گی۔ مگر میری قسمت میں شادی لکھی تھی۔ جو کہ باپ کی وصیت کے مطابق مجھے کرنا پڑی۔ لیکن شادی کے بعد بھی میں اسے نہ بھلا سکی۔ چنانچہ آج سے دو سال پیشتر میں نے اسے آپ کے پاس ملازم کرا دیا۔ اس سے یہی مراد تھی۔ کہ میں گاہ بگاہ اسے دیکھتی رہوں۔ کیونکہ ممتا سے مجبور تھی ضیا کو صرف یہ بتایا گیا تھا۔ کہ میں رشتہ سے اس کی خالہ ہوں۔ اور اس سے وعدہ لیا گیا تھا کہ وہ اس رشتہ کا کسی پر اظہار نہ کرے گا۔

جب ہاجرہ یہ سب واقعات بیان کر چکی۔ تو اسے معلوم ہوا کہ ناصر غشی کی حالت میں بے حس و حرکت پڑا ہے۔ تلوے سہلائے گئے گلاب چھڑکا گیا۔ ہوش آیا تو اس نے اشارہ کیا۔ کہ مجھے سیدھا کر کے بٹھاؤ۔ چنانچہ گاؤ تکیے کے سہارے بٹھا دیا گیا۔ چند منٹ تک وہ ہاجرہ اور ضیاء کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر زبان سے ادا نہ کر سکتا تھا۔ آخر بڑی مشکل سے اُس نے اپنے حواس درست کئے اور وارفتگی کے عالم میں بازو پھیلا کر لڑکھڑاتی زبان سے کہنے لگا۔ جانِ پدر ضیا! آ۔ اور میرے سینے سے لگ کر اس تڑپتے ہوئے دل کو تسکین دے آنسوؤں

میں خون کی کشش کو بھی نہ پہچان سکا۔ ہاجرہ تمہارا بے وفا نوہ میں ہی ہوں تعجب ہے کہ میں نے تمہیں بھی نہیں پہچانا۔ مجھے معاف کرو۔ میں نے تمہیں اور تمہارے بچے کو بہت تکلیف دی۔ میں بہت پشیمان ہوں۔ بیشک تمہاری محبت بالکل سچی تھی۔ اور تمہارا جذبۂ محبت اس قدر قوی تھا۔ کہ مجھے تمہارے پاس کھینچ لایا۔ میں نے تمہارے ساتھ دھوکا کیا۔ مگر سچی محبّت کی فتح ہوئی۔

(۹)

عید کے دن اسی حسین وادی میں جھیل کے کنارے ناصر و ہاجرہ یوم محبت منانے آئے ہوئے تھے بارہ دری دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ یہ دونوں پھولوں کی کشتی میں بیٹھے یوم محبت کی پُرکیف مسرتوں سے ہم کنار ہو رہے تھے۔ سامنے درخت میں جھولا پڑا تھا۔ ریحانہ جھولے میں بیٹھی تھی اور ضیا جھولا جھلا رہا تھا۔ کہ ناصر و ہاجرہ نے ایک دوسرے کو پُر معنیٰ نگاہوں سے دیکھا۔ گذرے ہوئے زمانہ کا ہو بہو نقشہ انکے سامنے تھا۔

اختتامیہ

آپ نے "لاشوں کا شہر" کے تمام افسانے پڑھے۔ بلکہ ان کے متعلق شاید اپنی تھوڑی بہت رائے بھی قائم کر لی ہو۔ اب دیکھئے شوکت تھانوی نے انہی افسانوں کے متعلق کیا کہا ہے۔ ممکن ہے اسی مطالچہ[1] کے مطالعہ کے بعد غور و فکر کی بعض نئی راہیں بھی نکل آئیں۔

۶ر جولائی ۴۳ء، آج میں نے محترمہ مسز عبد القادر والدہ سراج الدین صاحب ظفر کے افسانوں کا مجموعہ "لاشوں کا شہر و دیگر افسانے" شروع کیا۔ میرے مطالعہ میں اسوقت جو نسخہ ہے وہ اس کتاب کے چوتھے ایڈیشن کا حوالہ دے رہا ہے۔ گویا یہ اُردو کی اُن چند خوش نصیب کتابوں میں سے ایک ہے جسکے چار ایڈیشن چھپ سکے۔ اس مجموعہ میں کل سات افسانے ہیں گویا میری تین راتوں کا سامان، بہر حال اس کتاب کو شروع کرتا ہوں جس کے تین ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

---

[1] شوکت تھانوی اس عنوان کے تحت ماہنامہ "کتاب" میں ایک مدت تک لکھتے رہے ہیں۔ یہ مضمون ستمبر ۴۳ء کے شمارے میں چھپ چکا ہے۔

پہلا افسانہ "راکھشس" میں نے غلطی کی۔ اِس کتاب کو رات کیوقت نہ پڑھنا چاہیئے تھا اچھی خاصی ہیبتناک کہانی ہے۔ مگر دلچسپ اس قدر ہے کہ خوف دلچسپی میں دب کر رہ جاتا ہے۔ زبان بھی اچھی ہے اور بیان بھی بہت اچھا۔ پھر پلاٹ تو اس قیامت کا دیا ہے کہ اوریجنل افسانہ ہوتے ہوئے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی مغربی شاہکار کا ترجمہ ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم اپنی افسانہ نگاری کی طرف سے اس حد تک اپنی کمزوری کے قائل ہو کر رہ گئے ہیں کہ اگر کوئی سلیقہ کا پلاٹ کہیں نظر آجاتا ہے تو ذہن فوراً اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ یہ کسی مغربی مصنف کا شاہکار ہے جس کو اُردو زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ گویا شاہکار پیش کرنا صرف مغرب والوں کے لئے مخصوص ہے مگر مسٹر عبدالقادر کا یہ طبع زاد افسانہ کہیں سے نہ ترجمہ ہے نہ کسی کا چربہ۔ اور پھر بھی ہر اعتبار سے نہایت مکمل ہے راکھشس" بلاس "خدا کرے آج رات خواب میں نظر نہ آئے۔ ورنہ اس کو مغلوب کرنے والا تعویذ ہم کہاں سے لائیں گے۔

اس افسانے کے اثرات دور کرنے کیلئے دوسرا افسانہ "معلّم کا راز" پڑھا۔ اس افسانے میں بھی خوف اور دلچسپی تو خیر ساتھ ساتھ تھی ہی مگر تیسری ایک اور چیز بھی تھی جس سے میری روح ہمیشہ فنا ہوئی ہے، یعنی سانپ معلّم کے راز کے ساتھ ہی ساتھ میرا بھی ایک راز سن لیجئے کہ ویسے تو میں ڈرپوک نہیں ہوں۔ مگر جن چیزوں سے میری جان پر بن جاتی ہے ان میں سے ایک سانپ بھی ہے معلوم نہیں کیوں سانپ کا ڈر میرے دل و دماغ پر نہیں بلکہ میری ہستی پر ایسا چھا کر رہ گیا ہے کہ مشکل سے چند راتیں ایسی ہوتی ہونگی کہ مجھ کو سوتے وقت سانپ کا خیال نہ آتا ہو۔ کہ اس کا گذر ہو گیا۔ اور وہ چارپائی پر میری تلاش میں چلا آیا۔ اور اس نے ایک ہلکی سی پھنکار کے ساتھ ذرا سا مجھ کو چاٹ لیا۔ تو بس سوتا کا سوتا ہی رہ جاؤں گا۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ رات کو میز پر بیٹھے لکھ رہے ہیں۔ کہ دماغ کے گوشہ میں سانپ کا تصور رینگ گیا

بس پھر کیا تھا۔ پیر اٹھا کر فوراً کرسی پر رکھ لئے۔ اور میز کے نیچے اچھی طرح جھانک کر دیکھ لیا کہ کہیں سانپ بیٹھا تو نہیں ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ اس اطمینان کے بعد شک باقی نہیں رہتا۔ عجیب عجیب خیال آتے ہی رہتے ہیں۔ ممکن ہے میز کی دراز میں ہو، کیا عجب ہے کہ کرسی کے پایہ سے لپٹا ہو، یا ابھی نہ آیا ہو۔ اب آئے۔ حالانکہ کبھی وہ آیا نہیں۔ مگر ع

وہ گو آئے نہیں آتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں

اس افسانے میں تو قیامت ہی تھی۔ سانپ ہی کا شروع سے آخر تک ذکر، گویا افسانے کا ہیرو بھی معلم کم اور سانپ زیادہ۔ افسانہ پڑھنے کے دوران میں بار ہا چارپائی کے نیچے جھانکنا شروع کر دیا۔ اور ایک مرتبہ تکیہ کے نیچے بھی دیکھ لیا۔ کہ شاید احتیاط سے یہاں رکھا ہوا مل جائے۔ ڈلائی اٹھا کر جھاڑی کہ مبادا اسی کو اوڑھے ہوئے کوئی کالا کالا پھن دار سانپ سو رہا ہو۔ افسانہ پڑھ چکنے کے بعد ہر طرف سانپ رینگتے ہوئے نظر آئے۔ اگر یہ افسانہ ایسا ہی دلچسپ نہ ہوتا۔ تو میں سانپ کا نام آتے ہی افسانہ تو افسانہ کتاب ہی کو بند کر دیتا۔ مگر افسانے کی دلچسپی نے سانپ کے باوجود افسانہ ختم ہی کرا دیا۔ اب تو تیسرا افسانہ پڑھنا اور بھی ضروری ہو گیا۔ ورنہ ساری رات تصور میں سانپ سرسراتے رہتے۔

تیسرا افسانہ "گلنار" پڑھنا شروع کیا۔ بمشکل تمام پتہ چلا یہ حسین نام کسی حسینہ کا نہیں بلکہ وہ تو ایک خسیسہ کی کالی کلوٹی بلی تھی۔ جس میں بعد کو اس حسینہ کی سوت کی روح سما گئی اور اس نے اسی حسینہ کے "بچے" کو مارنا چاہا۔ مگر خود مار ڈالی گئی۔ در اصل اس قسم کی کہانیاں ہماری بڑی بوڑھیاں نہایت بھونڈے طریقے سے سنایا کرتی ہیں۔ اکثر ان کی چشم دید ہوتی ہیں اور اکثر ان کی بڑی بوڑھیوں پر بیتی ہوئی۔ جن پر سننے والی لڑکیاں زیادہ تر ہنس دیتی ہیں۔ مگر خوابوں میں ڈرتی رہتی ہیں۔ مسز عبدالقادر نے اسی قسم کی کہانی کو نہایت

سلیقہ کے ساتھ ایک اچھا خاصہ افسانہ بنا دیا ہے۔

۷ر جولائی ۴۳ء، شکر ہے کہ کل رات کو مسٹر عبدالقادر کے کسی افسانے کے کسی کردار نے مجھ کو خواب میں نہیں ستایا۔ اور نہ سانپ کے تصور سے زیادہ پریشانی اٹھائی یونہی ایک آدھ مرتبہ اِدھر اُدھر دیکھ لیا۔ پھر اپنے اس وہم پر خود ہی ہنسی آگئی۔ آج اس کتاب کا چوتھا افسانہ "زیتون" پڑھا۔ یہ افسانہ ہیبتناک نہیں بلکہ نہایت ہی دلچسپ ہے۔ پلاٹ کو نہایت خوبصورتی سے پیچیدہ بنا کر نہایت عمدگی سے عجیب عجیب عقدہ کشائیاں کی گئی ہیں البتہ افسانے کا آخری حصہ جب یاسمین (زیتون) کی شادی ہو جاتی ہے اس کے بعد سے کہانی نے جو رُخ بدلا ہے وہ کچھ غیر حقیقی سا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا شوہر اسکو کسی طرح دیکھتا ہی نہیں۔ بغیر اس کے دیکھے ہوئے اپنی ایک تخیلی محبوبہ کے عشق میں اس سے نفرت شروع کر دیتا ہے۔ اور ایسی نفرت کہ کبھی بھول کر بھی اس کے چہرہ پر نظر نہیں ڈالتا۔ وہ سو رنگ کے جلوے دکھانا چاہتی ہے۔ اور وہ حضرت اس طرح اس کو دیکھنے سے گریز کرتے ہیں گویا نظر پڑگئی تو پتھر ہو کر رہ جائیں گے۔ آخر برسوں کے بعد ایک مرتبہ جب وہ اپنی تخیلی محبوبہ کی تصویر بنا رہے تھے۔ بیوی یکایک سامنے آجاتی ہے اور وہ اس کو دیکھتے ہی اس کے قدموں پر گر جاتے ہیں۔ یہ تخیلی محبوبہ اسی کی بیوی تھی۔ اس عجیب و غریب بات سے یہ افسانہ اس دور سے بہت پیچھے جا گرا ہے۔ اور واقعہ بننے کے بجائے محض کہانی ہو کر رہ گیا ہے۔

اس کے بعد پانچواں افسانہ "لاشوں کا شہر" پڑھا۔ الاماں و الحفیظ۔ جسم کے تمام رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک قبرستان کے تمام مُردے چاروں طرف سے، دانت نکال نکال کر گھیرے ہوئے ہیں

افسانہ دلچسپ ضرور ہے مگر اس افسانے کی خوفناک زمین دلچسپی کے نقوش ابھرنے نہیں دیتی۔ اس افسانہ کو بھی وہی بڑی بوڑھیوں کی خوفناک کہانیوں والا پلاٹ دیا گیا ہے مگر وہ ہوتی ہیں سپاٹ قسم کی بے رنگ کہانیاں۔ اور یہ ہے ادبی رنگ میں رنگا ہوا ایک ہیبتناک افسانہ۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ پڑھنے والے کو اس قسم کے افسانے پڑھنے سے پہلے آیتہ الکرسی اچھی طرح یاد ہونا چاہیئے۔ حالانکہ خوف تو وہ بلا ہے کہ آدمی گھبرا کر آیتہ الکرسی کی جگہ دعائے گنج العرش شروع کر سکتا ہے۔ اور پھر بیچ میں عہدنامے کی بھی کچھ آیات آسکتی ہیں۔ مگر ہم پر یہ نوبت نہ گذری۔ ورنہ والئے لاحول کے سوا ان بدروحوں کی تواضع شاید کسی اور چیز سے نہ کر سکتے۔ یہ افسانہ کافی طویل ہے۔ لہذا آج اسی کو پڑھتے پڑھتے نیند کا غلبہ شروع ہو گیا۔ چاہتے تو یہ تھے کہ اس افسانے کا خوفناک اثر دور کرنے کے لئے کوئی اور افسانہ بھی پڑھ لیں۔ مگر نیند نے ڈرنے کی مہلت نہ دی۔ اور سو گئے۔

۸ جولائی ۴۳ء، رات کو خواب میں کسی لاش نے پریشان نہ کیا نہ کوئی مردہ نظر آیا۔ آج میں نے اس کتاب کا چھٹا افسانہ "آواگون" پڑھا مسئلہ تناسخ اور حیات بعدالممات کو اس افسانے میں ایک عجیب زنجیر کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ کہ جوان ماں اپنے بڈھے بچے کو پہچان لیتی ہے یا بوڑھی عورت اپنے جوان العمر باپ کو پا کر بے حد خوش ہوتی ہے۔ اگر اس افسانہ کو نہایت خوبصورت پلاٹ نہ دیا جاتا۔ تو یہ ایک بہت اچھا مزاحیہ افسانہ بن کر رہ جاتا۔ مجھے تو اس تصور ہی سے ہنسی آتی رہی کہ ایک لڑکی ایک بڈھے کو میرا بچہ میرا بچہ کہہ کر پیار کرے یا ایک بوڑھی عورت ایک نوجوان کو پتا جی کہہ کر مخاطب کرے۔ مسئلہ تناسخ غلط ہے

یا صحیح، یہ ایک دوسرا مسئلہ ہے۔ مگر تناسخ ہیں اگر حافظہ بھی قائم رہے تو قیامت ہی ہے۔ اس افسانے میں قیامت برپا نظر آتی ہے۔ مگر بحیثیت مجموعی افسانہ ہے بہت دلچسپ۔ اسی افسانہ میں مصنف نے ایک جگہ جہنم کی سیر کرائی ہے۔ جہنم کے متعلق جو تصور اب تک قائم تھا۔ وہ تو خیر کچھ اور ہی تھا۔ مگر اس مطالعہ نے جس جہنم سے دوچار کیا۔ اس سے تو واقعی روح کانپ گئی۔ ایسی مکمل تصویر جو صرف دیکھی نہ جائے بلکہ محسوس بھی کی جائے۔ آرٹسٹ کا کمال ہے۔ اور اپنے اس باکمال آرٹ پر مسٹر عبدالقادر مبارکباد کی مستحق ہیں۔

اس کتاب کا ساتواں اور آخری افسانہ "یوم محبت" ہے۔ اس افسانے کو میری رائے میں اس کتاب کا سب سے بہتر افسانہ کہنا چاہیئے۔ یہ ہیبت ناک افسانہ نہیں ہے۔ نہ کوئی معمولی کہانی ہے۔ بلکہ یہ تو ایک نظم ہے۔ جس کو پڑھنے والا دیکھتا چلا جاتا ہے۔ نہایت پاکیزہ رومان۔ چونکا دینے والے افسانوی نشیب و فراز۔ مختصر یہ کہ ہر اعتبار سے ایک مکمل افسانہ۔ اس کتاب کے باقی افسانے تو عالمِ ارواح ۔ مسئلہ تناسخ اور پُر اسرار اور محیر العقول واقعات کو لئے ہوئے ہیں۔ مگر یہ افسانہ ایسا ہے کہ گویا ہم پر بیتا ہوا قصہ ہو۔ پڑھنے والا اس کے پلاٹ میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور باقی چھ افسانے جس قدر لرزا چکتے ہیں۔ اسی قدر اس کو پڑھ کر روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔

(محمد یامین خان کاتب)